# URDU NAVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT
# (Impacts of India's Partition on Urdu Novels)

THESIS FOR Ph.D. (URDU)


Submitted By

**NIKHATH JAHAN**

Supervised By

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**

READER DEPARTMENT OF URDU





**DEPARTMENT OF URDU**

School of Humanities

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD 500 134.

# URDU NAVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT
# (Impacts of India's Partition on Urdu Novels)

THESIS FOR Ph.D. (URDU)


Submitted By

**NIKHATH JAHAN**

Supervised By

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**

READER DEPARTMENT OF URDU





**DEPARTMENT OF URDU**

School of Humanities

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD 500 134.

# URDU NAVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT
# (Impacts of India's Partition on Urdu Novels)

THESIS FOR Ph.D. (URDU)


Submitted By

**NIKHATH JAHAN**

Supervised By

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**

READER DEPARTMENT OF URDU





**DEPARTMENT OF URDU**

School of Humanities

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD 500 134.

# URDU NAVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT
# (Impacts of India's Partition on Urdu Novels)

THESIS FOR Ph.D. (URDU)


Submitted By

**NIKHATH JAHAN**

Supervised By

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**

READER DEPARTMENT OF URDU





**DEPARTMENT OF URDU**

School of Humanities

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD 500 134.

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**
Reader, Urdu Department
University of Hyderabad
HYDERABAD - 500 134

## C E R T I F I C A T E

This is to certify that the thesis entitled **"URDU NOVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT"** (Impacts of India's partition on Urdu Novels) submitted by **NIKHATH JAHAN** for the degree of Doctor of Philosophy to the Department of Urdu, School of Humanities, University of Hyderabad has been carried out under my supervision and embodies the result of bonafide research work.

I certify further that such help or source of information as had been availed of by the researcher in the course of the work has been duly acknowledged.

I recommend that the thesis be sent to the examiner for evaluation.

**DR. RAHMATH YOUSUF ZAI**
(SUPERVISOR)

STATION: HYDERABAD

DATE : 2/5/94

2/5/94.

**HEAD DEPARTMENT OF URDU**

Depart...
University...
Hyderabad 500 134

**DEAN SCHOOL OF HUMANITIES**

K.K. Ramanamma
DEAN
SCHOOL OF HUMANITIES,
University of Hyderabad,
Hyderabad-500 134.

## DECLARATION

I hereby declare that this thesis entitled **"URDU NOVELAON PER TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT"** (Impacts of India's partition on Urdu Novels) submitted for the degree of Doctor of Philosophy to the University of Hyderabad, embodies the result of bonafide research work carried out by me under the supervision of **Dr. Rahmath Yousuf Zai**, Reader, Department of Urdu. It has not been submitted either in part or in full for any other degree or diploma to this or any other university.

STATION: HYDERABAD

DATE : 2-5-94

Nikhath

**NIKHATH JAHAN**
DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD-500 134

# اُردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

۱۹۹۴ء


مقالہ نگار
نکہت جہاں

نگران
ڈاکٹر رحمت یوسف زئی



شعبۂ اُردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

# ترتیب ابواب


ابتدائیہ ۱ - ۱۲

پہلا باب ۱۳ - ۴۶

ناول کی تعریف - اردو ناول ابتدائی عہد میں

دوسرا باب ۴۷ - ۸۷

بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں خواتین کی ناول نگاری کا مختصر جائزہ

اُردو کے اہم ناولوں میں معاصر زندگی ۱۹۴۷ء تک

تیسرا باب ۸۸ - ۱۱۶

ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کا سرسری مطالعہ - ملک کی تقسیم

ادب پر تقسیم کے اثرات

چوتھا باب ۱۱۷ - ۳۶۱

اُردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات

اختتامیہ ۳۶۲ - ۳۷۷

کتابیات ۳۸۴ - ۴۸۸

# اِبتدائیہ

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا
اور ساتھ ہی مذہب کو بنیاد بنا کر ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔
مذہب کے نام پر کی گئی اس تقسیم کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ اس
کے پس منظر میں فرقہ وارانہ فسادات کی طویل تاریخ تھی۔
آزادی کا تصور جتنا خوش آئند تھا لیکن اس
آزادی کو ہزاروں برس پرانی تہذیبی روایات کے خون سے رنگ
کر حاصل کرنا بہت ہی شرم ناک پہلو تھا۔ اور پھر ہندوستان اور
پاکستان میں اقلیتوں کو یرغمال سمجھ لیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا
کہ اگر کسی علاقے میں اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی ہو گی تو اس کا
بدلہ دوسری جگہ لیا جا سکے گا۔ اس ذہنیت نے نفرت اور انتقام
کی آگ کو اور ہوا دی۔ اس تقسیم نے اس تہذیبی معاہدہ کو توڑ
دیا جو ہندوستان کی مختلف قومیتوں کے درمیان تھا۔
اس تقسیم کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی تھا کہ
بنگال اور پنجاب کے وہ صوبے جو معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی
اعتبار سے ایک ہی قومیت کے جزو تھے تقسیم کر دیئے گئے اسی کے

ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے فسادات کا وہ بھیانک طوفان اٹھا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ آزادی ملتے ہی باہمی طور پر نفرت میں اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تمام شہری ہندو، مسلمان اور سکھ ہو گئے انسان کوئی نہ رہا۔ مغربی پنجاب، سرحد اور مشرقی پنجاب، دہلی، کلکتہ اور بہار میں انسانی زندگی کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر ہو گئی۔ ان فسادات میں اشرف المخلوقات نے درندگی کا وہ شرف حاصل کیا اور قتل کے ایسے طریقے اختیار کیے جس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ ممکن نہیں۔

تقسیم کا یہ زخم اردو ادب کے لیے بہت ہی روح فرسا تھا۔ مشترکہ کلچر اور متحدہ قومیت کے تصورات ذبح کر دیے گئے تھے ان سب سے بڑھ کر ہماری تاریخ کا بڑا المیہ یہ بھی تھا کہ زبان کو بھی تقسیم کی ایک بنیاد بنایا گیا تھا اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا۔ چناں چہ تقسیم ہند کے المیے نے پوری ہندوستانی تاریخ کو سرحد کی دونوں طرف تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا دیا تھا اور باشعور افراد

اپنی جڑوں کی تلاش کرنے لگے تھے۔ خاص کر نئی نسلوں کا دماغ سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ نہ صرف عام انسان بلکہ ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار بھی اس کرب سے گزر رہے تھے۔

آزادی کے بعد ہر صغیر میں سیاست، معیشت معاشرت اور تہذیب کے ہر شعبے میں جو دور رس تبدیلیاں آئیں فسادات اور ہجرت کے مصائب اور مسائل نے جو ہیجانی صورت حال پیدا کی اس نے مدت تک ادیبوں کو ذہنی اور تخلیقی تعطل کا شکار بنائے رکھا۔ ناول کی تخلیق دراصل ایک تخلیقی ہی نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ یا فکری عمل بھی ہے جو زندگی کے ٹھوس حقائق کی تفہیم و تعبیر کے لیئے گہری سماجی بصیرت اور تجزیاتی قوت کا مطالبہ کرتی ہے اس لیئے تقسیم کے المیہ کے بعد یہ تعطل فطری تھا۔

تقسیم کے بعد فسادات کے خونیں واقعات کو اکثر ناول نگاروں نے اپنا موضوع بنایا۔ فسادات کے پس منظر میں جو ناول ملتے ہیں ان میں عام طور پر یہ نظریہ حاوی ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان میں ایک مشترکہ تہذیب جڑ پکڑ چکی

تھی۔ نسلی، علاقائی اور مذہبی اختلافات کے باوجود ہندوستانی عوام ایک رشتہ یگانگت میں بندھے ہوئے تھے لیکن سامراجی طاقتوں کو ایک مشترکہ آزاد ہندوستان اپنے مفادات کے لیئے بہت بڑا خطرہ نظر آتا تھا اس لیئے غیر فطری اور غیر عقلی بنیادوں پر تقسیم کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور اس کے لیئے کسی نے کانگریس کو تو کسی نے مسلم لیگ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

یوں تو ناول پر بہت سے اہل قلم حضرات نے خامہ فرسائی کی ہے لیکن تقسیم ہند سے راست طور پر متاثر ہونے والے ناول اکثر نظر انداز کر دیئے گئے یا پھر ان کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے یہی وجہ اس موضوع کو منتخب کرنے کا سبب بنی۔

یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کے ہنگامی حالات، سانحات، حادثات اور اتفاقات ادب کا جزو بن سکتے ہیں؟ اس لیئے کہ یہ تو Dated mater ہونے کی حیثیت سے حماقت کا ایک حصہ قرار دیئے جائیں گے۔

راقمہ کے خیال میں اگر کسی واقعہ کو جوں کا توں

پیش کر دیا جائے تو ہم اس کو رپورٹنگ تو کہتے ہی ہیں جو
صحافت کا ایک جزو ہے لیکن ادب کے لیئے جو ضروری عناصر
ہیں یعنی اظہار خیال میں ندرت، بلاغت، فصاحت اور
Suggestivity، صحافت ان اجزاء سے عاری ہوتی ہے۔ اگر
کوئی شعر، نظم، افسانہ یا ناول کسی واقعہ کے ردعمل کے طور پر
تخلیق ہوگا تو یہ دیکھنا بے حد ضروری ہے کہ اس میں آفاقی قدریں
کس حد تک موجود ہیں شائد اسی کے ذریعہ ہم ادب میں اس
کے مقام کا تعین کر سکتے ہیں لیکن اس کو صرف صحافت ادب سے خارج
نہیں کر سکتے جس میں مندرجہ بالا عناصر کا فقدان ہو کیوں کہ
زمانے کے ساتھ ساتھ ہنگامی صورت حال آفاقی صورت حال
میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو افراتفری مچی جن
سماجی، سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی گتھیوں سے انسان کو الجھنا
پڑا اس کے اثرات یقیناً تقسیم کے بعد تخلیق کیئے جانے والے ادب
میں نظر آئیں گے۔ اگر واضح طور پر نہیں تو علامتی یا استعاراتی انداز
میں یا رمز و کنایہ میں وہ سارے عوامل کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی
صورت میں ضرور جلوہ گر ہوں گے۔ کیوں کہ ادب ایک حساس

ذہن کا تخلیقی کارنامہ ہوتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی
جڑیں ہمارے سماجی اور تہذیبی عوامل میں پیوست ہوتی ہیں
کوئی ادب خلاء میں جنم نہیں لے سکتا اور تخلیق کار کے ذہن کو
مہمیز کرنے کے لیے کچھ ایسے ہی ہنگامہ خیز واقعات کارفرما
ہوتے ہیں۔ ناول چوں کہ ایک وسیع کینوس پر انسانی زندگی
کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتا
ہے اسی لیے ناول پر کسی بھی ہنگامے یا واقعے کا اثر ہونا ایک
لازمی امر ہے کیوں کہ اگر Suggestivity ادب کا ایک
اہم جزو ہے تو پھر یہ واقعات کی رہنمائی ہی سے ممکن ہے۔
دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جس طرح مصور اپنی تصویر میں
ایسے رنگوں کا استعمال کرتا ہے جن سے تصویر اصل کے قریب
محسوس ہونے لگتی ہے بالکل اسی طرح ایک ناول نگار اپنے
ناول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ایسے واقعات کا
سہارا لیتا ہے جو اس کے اطراف میں وقوع پذیر ہوتے رہے
ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ریورٹنگ ہو یا پروپگنڈہ کی خاطر
کوئی ادب پارہ گھڑ لیا جائے تو وہ ادب میں اعلیٰ مقام

حاصل نہیں کر سکتا ۔ لیکن اگر اس میں فن کار نے خون جگر صرف کیا ہو تو یقیناً اس میں معجزۂ فن نظر آئے گا ۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تقسیم ہند کے واقعے کو تقریباً نصف صدی کا عرصہ گذر چکا لیکن تقسیم ہند کے اثرات آج تک فکر اور فن دونوں سطحوں پر ہماری کہانیوں اور ناولوں پر غالب ہیں اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ تقسیم ہند نے جس مذہبی منافرت کو جنم دیا وہ منافرت آج تک نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قائم ہے بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں دن بہ دن نئے روپ اختیار کر کے تہذیب، تمدن، اور عام سماجی رشتوں میں بھی زہر گھولتی جا رہی ہے ۔

بیشتر ناولوں میں تقسیم ہند کو موضوع بنایا گیا لیکن تمام ناولوں کا جائزہ اس وجہ سے ناممکن تھا کہ پندرہ اگست ۱۹۴۶ء یعنی کلکتہ کے قتل عام سے لے کر فسادات کی وہ لہر جو نواکھالی، بہار، راولپنڈی سے گزرتی ہوئی ۱۹۴۷ء تک اور پھر تقسیم کے بعد تک چلتی رہی اس کے نتیجہ میں زمانے کی شاید

ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس پر تقسیم کے فسادات کا اثر نہ ہو۔ یہ
سلسلہ بہت بعد تک چلتا رہا۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ
اس تخلیقی مقالے کو وسعت کے بجائے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش
کرے۔

کوئی بھی مطالعہ اگر سماجی معنویت نہیں رکھتا اور صرف
کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہے تو ایسا مطالعہ ادب کے لیئے مفرت
رساں تو ہوگا ہی پوری انسانیت کے لیئے بھی تکلیف دہ ہوگا۔
کیوں کہ یہ آدھا سچ ہوگا۔ راقم نے جب اس موضوع کو
منتخب کیا تو اس کی سماجی معنویت پر بھی غور کیا۔ کبھی کبھی
یہ محسوس ہوا کہ تاریخ شاید اپنے کو دہرانا چاہتی ہے شاید
ملک میں آج سیاسی صورت حال میں پھر وہی طاقتیں متقدم
ہیں جن کے نتیجہ میں تقسیم کا المیہ وجود میں آیا تھا۔ یہ مطالعہ
دراصل حال کے آئینہ میں ماضی کو پڑھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس
میں بہت ساری باتیں نہیں لکھی گئیں لیکن یہ "ان کہی" بین السطور سے
واضح ہو جائے گی اسی لیئے ہر ناول کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے
ہوئے راقم ہر لمحہ یہ سوچتی رہی کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے

بعد کس طرح کا معاشرہ وجود میں آتا ہے، افراد کی نفسیات کیسے بنتی ہے، سماج کن خطوط پر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ رشتے کس طرح ٹوٹتے اور جڑتے ہیں بنتے اور بگڑتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر بنیادی اقدار حیات پر کتنا زبردست اثر پڑتا ہے۔

مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ناول کی تعریف اور ابتدائی عہد کی ناول نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں خواتین کی ناول نگاری کے مختصر جائزہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء تک کے اہم ناولوں کا تجزیہ، تیسرے باب میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا سرسری مطالعہ، ملک کی تقسیم اور ادب پر تقسیم کے اثرات، چوتھے باب میں اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل میں جہاں خدا کا فضل اور مولا کا کرم شامل ہے وہیں والدین کی دعائیں اور مہربانیاں بھی شامل کار ہیں۔ میں آج جس مقام پر ہوں وہ ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

میرا یہ مقالہ استاد محترم ڈاکٹر رحمت
یوسف زئی صاحب ریڈر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی
آف حیدرآباد کی زیر نگرانی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ استاد محترم
کی سرپرستی، شفقت اور رہنمائی ہر ہر قدم پر نہ صرف میری
ہمت افزائی کرتی رہی بلکہ اگر یہ کہوں تو مبالغہ آرائی نہ
ہوگی کہ استاد محترم نے اس مقالے کی نوک و پلک سنوارنے
میں اپنی جانب سے جو کچھ ہو سکتا تھا سب کچھ کیا۔ میں ان کا
شکریہ ادا تو کرنا چاہتی ہوں لیکن اس لیئے شکریہ ادا نہیں
کر رہی ہوں کہ وہ مجھے نہ صرف آنکھیں دکھائیں گے بلکہ
زبردست ڈانٹ بھی ملے گی۔

صدر شعبہ پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ نے
مجھ ناچیز کو ہمیشہ اپنی شفقتوں سے مالا مال رکھا اور اپنی
بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود مجھے قیمتی مشوروں سے
سرفراز کیا۔

محترم اساتذہ پروفیسر ثمینہ شوکت صاحبہ
اور ڈاکٹر محمد انور الدین صاحب نے بھی حتی الامکان

رہنمائی فرمائی میں ان تمام کی ممنون ہوں۔

اس موقع پر مجھے ہر دل عزیز استاد محترم
پروفیسر سید مجاور حسین رضوی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا
ایک لازمی امر ہے۔ استاد محترم کی نگرانی میں، میں نے
ایم فل کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ آپ نے ابتدا ہی سے اپنی خصوصی
دلچسپی اور شفقت کے ذریعہ میری ہر ہر قدم پر رہنمائی
کی۔ اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں بھی استاد محترم کی رہنمائی
کو خاص دخل رہا ہے۔ وہ وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش
ہونے کے باوجود بھی وقتاً فوقتاً نہ صرف میرے کام کے
بارے میں دریافت کرتے رہے بلکہ حال ہی میں حیدرآباد
میں اپنی آمد کے موقع پر انھوں نے بعض اہم نکات کی طرف
میری توجہ مبذول کرائی۔

میری باجی (طلعت جہاں) اور بھائی نیئر نے
بھی حتی الامکان میری مدد کی۔

شجاعت علی راشد جو میرے ہم جماعت اور
اچھے دوست ہیں موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالہ کی

تکمیل تک ہر ہر قدم پر جس خلوص اور محبت کے ساتھ اپنا
فرض ادا کیا، چاہتی تھی کہ ان کا بھی شکریہ ادا کرتی چلوں
لیکن شکریہ ادا اس لیئے نہیں کر رہی ہوں کہ فرض کی
ادائیگی محتاج شکریہ نہیں ہوتی۔

میں شعبہ اردو سے وابستہ تمام افراد
اور اپنے ساتھی اسکالرس اور ان تمام حضرات کی بھی ممنون
ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میری مدد
کی، رہنمائی کی، یا نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

# پہلا باب

# ناول کی تعریف، اردو ناول ابتدائی عہد

ناول کا لفظ لاطینی زبان میں مختلف ہیئتوں سے
"نئے" کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے[۱] بوکیشو نے اپنی "دی کیمرون"
کے مقدمے میں اسے نئے قصّے کہانیوں اور تمثیلوں کے معنیٰ دیئے۔
انگریزوں نے اسے سیرتی و کرداری قصّوں کے لیئے مخصوص کیا۔ دراصل
ناول قصّے کی ارتقائی منزل ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی رائے میں

"قصّہ گوئی کا فن تہذیب انسانی کا ہم عمر ہے
جب ایک انسان نے دوسرے انسان کو اپنے
دن بھر کے تجربات سنائے اسی دم سے
قصّہ خوانی کی داغ بیل پڑ گئی"[۲]

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے سب سے پہلے جس ادبی
صنف میں دلچسپی لی وہ کہانی ہے۔ بہ قول وقار عظیم

"کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے کہانی انسان
کے ان کارناموں کی روئداد ہے جس میں

---

[۱] "انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا"

[۲] "تحریریں" ڈاکٹر گیان چند جین ص ۲۹

اس نے اپنے ماحول کی کسی متقادم قوت
کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے۔ کہانی
انسان کے احساس برتری کی تسکین کا
ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور
تخیل اور تصور اور رومان کے ایک
جہان تازہ کی تصویر ہے۔ کہانی کا یہی
تصور ہماری داستانوں کا بنیادی
تصور ہے۔" [۱]

اردو ادب میں تقریباً ایک صدی پہلے تک داستان گوئی اور اسی
تخلیقات جس میں مافوق الفطری یا محیّر العقول واقعات کی
بھرمار ہوتی مرکز توجہ بنتے رہے۔ جیسے قصّہ چہار درویش یا
میر امّن کی باغ و بہار، یا فارسی داستانوں کے ترجمے یا حاشیہ آرائی
کے ساتھ ترتیب دی ہوئی داستان امیر حمزہ، یا الف لیلیٰ وغیرہ۔
اردو میں ابھی داستان گوئی کا عہد ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک نئی
صنف ناول نے جنم لیا۔

---

[۱] "داستان سے افسانے تک" وقار عظیم ص ۸

ناول داستان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو میں اس فن کو مستقل حیثیت دینے میں انگریزوں کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ جب لارڈ مارنگٹن آف ولزلی کی شاہانہ ذہنیت نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کو حاکم بن کر رہنا ہے تو محکوم قوم کی ذہنیت، تہذیب اور زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی لیے فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا اور اس کالج کو جان گلکرائسٹ جیسا صاحب ذوق اور اعلیٰ تنظیمی اور ادبی صلاحیت رکھنے والا شخص ملا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور استحکام کے بعد ۱۸۵۷ء تک جو بھی حالات پیش آئے اس نے ہندوستان کی تہذیبی زندگی پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے جب ہندوستان پر اپنا تسلط مکمل کرنے اور برقرار رکھنے کی تدابیر پر غور کیا تو اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی سامنے آئی کہ تعلیمی اور تہذیبی انقلاب لایا جائے تاکہ ہندوستانی عوام ذہنی اور تعلیمی سطح پر مکمل طور سے انگریزوں کی گرفت میں آجائیں۔ یہ وہی دور ہے جب اور چیزوں کے علاوہ ناول نویسی کا فن

بھی اردو ادب میں روشناس ہوا۔ اور حالات اور واقعات
کی رفتار کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کی روشنی میں
یہ فن مسلسل ارتقاء کے منازل طے کرتا رہا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سائنس
کی نئی نئی ایجادوں نے خلوت کو بھی انجمن میں تبدیل کر دیا اور انسان
کو خود آگاہ بنا دیا۔ اسی خود آگاہی نے ناول کی اہمیت کو تمام
اصناف ادب میں بڑھا دیا۔ کیوں کہ تیزی سے ہونے والی تبدیلیوں
کو حقیقت اور تفصیلی طور پر صرف ناول نگار ہی پیش کر سکتا
ہے جس سے فائدہ اٹھا کر انسان ان حالات سے **جن** میں وہ گھرا
ہوا ہو نکلنے کا راستہ تلاش کر سکتا ہے یا سمجھ سکتا ہے۔

اگرچہ پرانی داستانوں میں بے خودی پیدا کرنے
کی اور دنیا سے بے فکر و بے تعلق کرنے کی صلاحیت تھی اس
میں ایسا ماحول اور فضاء پیش کیے جاتے تھے کہ جس کا حقیقی
دنیا کے تلخ حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ
سب کچھ ہوتا جو خیالی ہوتا یا پھر جس کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ اس
زمانے کی توہم پرستی کی وجہ سے لوگ بڑی شدت سے ان

مافوق الفطرت عناصر پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن داستان
خوابوں کا سفر تھی زندگی کی حقیقتوں سے کوسوں دور انسان
کو خوابوں کے ان جزیروں میں لے جاتی تھی جہاں تحیّر، مسرت
اور عیش کی تتلیاں اڑتی تھیں۔ چناں چہ جب علی گڈھ تحریک کے
زیر اثر جو اصلاح پسندی کا رجحان رونما ہوا اس نے نثری ادب
میں سماجی زخموں کو کریدنے کی کوشش کی اسی کے نتیجہ میں ناول
وجود میں آیا۔ ناول نگاری کے ذریعہ سماجی زندگی کے حقیقی پہلو
اور زندگی کے تلخ حقائق پیش کرنے کی راہ نکالی گئی اور فرضی اور
تخیلاتی واقعات سے گریز کیا گیا۔

مختلف ناقدوں اور ناول نگاروں نے ناول کی تعریف
مختلف انداز سے کی ہے۔ انگلستان کی ادیبہ کلارا ریوز نے
ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی
سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے"۔ [1]

---

[1] بحوالہ "اردو ناول کی تاریخ اور تنقید" از علی عباس حسینی ص ۳۷

کم و بیش یہی خیال مرزا ہادی رسوا کا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں

"ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر
کر دیتا ہے جو اس نے اس زمانے میں دیکھے ہیں
یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیئے کہ تصویریں
ہیں کہ دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں کہ
انھیں کی نقل اتار اتار کر ناظرین کو دکھاتا ہے
مگر یہ ان ناول نویسوں کا ذکر ہے جنھوں نے
اس فن خاص میں فطرت کو اپنا معلم بنایا
ہے۔ جو ناول نویس اس باریکی کو نہیں جانتے
دھوکہ کھاتے ہیں۔ کسی قصہ کو دلچسپ بنانے
کے لیئے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایسی
غلطی ہے جس سے کہنے والے کی قلعی کھل
جاتی ہے۔ فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی
ہیں ان سے بہتر مثالیں ہم کو نہیں مل سکتیں۔" [1]

---

[1] "دیباچہ ذات شریف" از مرزا ہادی رسوا ص ۳

مسٹر مور کا خیال ہے کہ

"ناول زمانہ موجودہ کی تاریخ ہے اور اس عہد کی
کامل ترین تصویر جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔" [1]

ڈی ایچ لارنس کا خیال ہے کہ

"ناول انسانی خیالات اور جذبات کو پیش
کرنے کے لیئے عظیم ترین صنف ادب ہے۔" [2]

ای۔ ایم فورسٹر کہتا ہے

"ناول ایک خاص طوالت کا نثری قصہ ہے۔" [3]

ناول زندگی کا ترجمان ہوتا ہے جو حقیقی زندگی کی ہو بہو شکل پیش کرتا
ہے اس لیئے چٹ پادھیائے نے کہا ہے

"ناول کو انسانی زندگی کا عکس ہونا چاہیئے نہ کہ صرف
تجربات کی کھتونی۔" [4]

---

[1] بحوالہ "اردو ناول کی تاریخ اور تنقید" از علی عباس حسینی ص ۴۴

[2] Novel and The Modern World By David Daiches P. No. 140

[3] Aspects of The Novel By E. M. Forster P. 9

[4] The Technique of English Novel By Chattapadhaya P. 2-

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اسے "نیچرل قصہ گوئی" کہتے ہیں"۔ [1]
کیوں کہ ناول ادب کی وہ صنف ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہوتا
ہے اور جو زندگی کی تشریح کرتا ہے۔

ان مختلف آراء کا جائزہ لینے کے بعد ناول کی مختصراً یوں
تعریف کی جاسکتی ہے کہ ناول نام ہے ایک ایسی صنف ادب کا جو نثر میں
ہو، جس میں انسان اور اس کی زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا گیا
ہو۔ ناول واقعات کا دلچسپ زمانی اظہار ہوتا ہے۔ واقعات
کے زمانی اظہار میں اس دور کے معاشرے کے رسوم و رواج کا اظہار،
یا سماج میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ان کا اظہار جسے ہم
عصری حسیت بھی کہہ سکتے ہیں، شامل ہے۔ اس میں زندگی کی ابدی
قدروں کا اظہار کرداروں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ اور ہم اپنے
مافی الضمیر کو مختصر اور موثر طور پر ناول کے ذریعہ پیش کر سکتے
ہیں۔ اس طرح ناول ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کہانی کی
بنیاد تخیل کے بجائے حقیقت پر رکھی گئی ہو اور جس کا موضوع کلی زمانی
اظہار ہو۔

---

[1] "ادبی تخلیق اور ناول" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ص ۱۱

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر عام انسان کی طرح ایک ناول نگار کی حرکت اور عمل اس دنیائے آب و گل میں ایک ہی طرح ہے۔ وہ بھی سب کی طرح زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے دوچار ہوتا ہے اور تجربات حاصل کرتا رہتا ہے۔ جہاں وہ دنیاوی حالات سے اثر پذیر ہوتا ہے وہیں اپنی ذات کو بھی متاثر کرتا ہے اور ہر واقعہ کے متعلق اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر قائم کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق سے دوسرے بھی متاثر ہوں۔ اسی بنیاد پر اپنے خیال کو اپنی تخلیق یعنی ناول میں پیش کرتا ہے۔ اگر ایک فلسفی کو دنیا میں چاروں طرف خوشی اور مسرت نظر آتی ہے تو دوسرے کسی رجائیت پسند اور قنوطی کو رنج و مظلومیت نظر آتی ہے اسی بنیاد پر ناول نگار اپنے مخصوص زاویہ سے کائنات پر نگاہ ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے اور ایک ہی طریقہ غور و فکر اختیار کر لیتا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہندوستانی ناول نگاروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ کمزوری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر یورپ اور فرانس کے ناول نگاروں کے پاس سرمایہ دارانہ طرز زندگی کی

عکاسی اور اس طرز زندگی کی تعریف یا برائی ہے تو جرمنی اور دوسری اقوام کے ناول نگاروں کے پاس تحقیقی یا سائنسی نقاط نظر کی فراوانی ملے گی تو تیسری طرف روسی ناول نگاروں نے جس طرح روس کی روح کو بے نقاب کیا ہے اور متوسط طبقے کے مرد اور عورتوں کی سیرت کو پیش کیا ہے اس کا جواب دوسرے ادبیات میں مشکل سے ملے گا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ۱۸۵۷ء کے سیاسی اور تہذیبی اثرات نے ہندوستانی معاشرے کو توہمات اور تصورات کی دنیا سے ہٹا کر حقیقت کی راہ دکھائی۔ مغلیہ سلطنت کے دامن میں جو تہذیب پروان چڑھی تھی وہ ایک عرصہ تک ثمر آور ہونے کے بعد یہاں پہنچ کر دم توڑ گئی اور اسی کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔ قدیم سماجی نظام اور نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور نئی سماجی قوتوں نے صرف فکر و نظر ہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالے۔ یہی دور سرسید کی تحریک کا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر اس زمانے میں جو خاص علمی اور مذہبی بحثیں ہوئیں انھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کے شعور اور

حقیقت پسندی کو ناگزیر قرار دیا نتیجہ میں ایک نئی ذہنی اور ادبی فضاء وجود میں آئی۔ انسانوی ادب پر ان کا یہ اثر ہوا کہ تخیلی اور طلسماتی ماحول کی جگہ حقیقی ماحول نے لے لی۔ اور کرداروں میں تصوراتی کے بجائے اخلاقی صفات کے مثالی افراد نے لے لی۔ وہ تمام اخلاقی صفات جو عمل اور خلوص پر مبنی ہوں اور قوم کو ترقی کی طرف لے جائیں اور جنمیں قوم کے اخلاق درست کرنے کے لیئے کام میں لایا جائے کرداروں میں تخلیق کیئے جانے لگے۔ ناولوں میں اس خصوصیت کو پیش کرنے اور اسے تکمیل تک پہنچانے میں مولوی نذیر احمد خصوصیت رکھتے ہیں۔

نذیر احمد اردو ناول نگاری میں وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے زندگی کے حقائق اور انسان کے غموں اور خوشیوں کو اپنے ناولوں کا موضوع قرار دیا اور اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی جہالت اور تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دور ایک طرف تو ہمات کا شکار تھا تو دوسری طرف مغرب کی تقلید ہی کو زندگی کا معیار سمجھے ہوئے تھا۔ چنانچہ اپنے ناولوں کو انھوں نے معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ معاشرے کی اصلاح کے لیئے انھوں

نے تعلیم نسواں پر زور دیا۔ چنانچہ اپنے پہلے ناول "مراۃ العروس"
کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تب مجھے اس کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق
و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں
جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں
اپنے توہمات اور جہالت کی وجہ سے ہمیشہ
مبتلائے غم رہا کرتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح
اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی
دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ
اکتائے۔ طبیعت نہ گھبرائے۔ مگر تمام کتب
خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا۔ پر
نہ ملا۔ تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ باندھا۔" [1]

چوں کہ یہ ناول ایک خاص مقصد کے پیش نظر لکھا گیا تھا اس لیے
اس میں وعظ و نصیحت کا رنگ غالب ہے۔ اس میں دو متضاد
کردار کی لڑکیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف ایک ایسی لڑکی ہے جو

---

[1] "مراۃ العروس" دیباچہ از نذیر احمد ص ۲

بدمزاج ہے اور دوسری طرف ایک سلیقہ مند اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ کرداروں کے اس تضاد سے نذیر احمد نے درس و تدریس کا کام بڑے سلیقہ سے لیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احسن فاروقی فرماتے ہیں۔

"اس کتاب کا سبق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مخصوص معلوم ہوتا ہے مگر گہری نظر ڈالنے والوں کو یہاں مزاج داری اور تمیز داری کی دائمی اخلاقی قدریں ملتی ہیں ان سب پر دنیا کے ہر گوشے میں کامیاب زندگی کا دارومدار ملتا ہے۔" [1]

"بنات النعش" ان کا دوسرا ناول ہے جسے مراۃ العروس کا دوسرا حصہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ناولوں کی تصنیف کے وقت علی گڈھ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ چوں کہ ابتدا میں نذیر احمد اور سرسید کے نظریات میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور معاشرتی مسائل کے حل میں بھی وہ سرسید کے نقطہ نظر سے بہت قریب تھے اسی لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں انگریزوں سے مصلحتاً سیاسی مفاہمت، انگریز

---

[1] "اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ص ۳۱

دوستی اور انگریزی تعلیم جیسے مقاصد کی تبلیغ کے لیئے بھی راہ نکالی ہے۔
وہ حصول علم کو حصول آزادی کے لیئے ضروری خیال کرتے تھے "بنات النعش"
کی ایک عبارت میں انھوں نے یہ نکتہ پیش کیا ہے۔

"ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم
ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی۔ نرے وحشی
تھے۔ . . . . رومیوں کی سلطنت تھی انھیں
سے انگریزوں نے عقل و سلیقہ سیکھا۔ یہاں
تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا"۔ [1]

"توبۃ النصوح" میں ایسے والدین کے حالات زندگی کو پیش کیا گیا ہے
جو ایک طویل عمر گزارنے کے بعد اپنی اولاد کی مذہبی اور اخلاقی تربیت
کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن وہ اس وقت تک مغربی تہذیب کے
رنگ میں رنگ چکے ہوتے ہیں۔ مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

نذیر احمد کے ناولوں میں "ابن الوقت" بہت اہم ناول ہے۔
اس میں نذیر احمد نے جس طرح سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ
لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان حالات کو سمجھنے کی کتنی گہری

---

[1] "بنات النعش" از نذیر احمد ص ۱۸۲

بصیرت رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے سیاسی تسلط سے ہندوستان کا صدہا سال کا سیاسی نظام زندگی جس طرح تباہ ہو گیا تھا اس کا جائزہ بالکل ایک مورخ کی طرح لیا ہے۔ انگریزوں نے قدیم نظام ختم کر کے جو جدید نظام قائم کیا اس کی وجہ سے ہندوستان میں جو معاشی ابتری آئی اس کا بیان بھی بڑی ہی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

"ابن الوقت" ایک شخص کی روئداد زندگی ہے جو انگریزوں کی صحبت میں ہندوستانی معاشرے کو بھول جاتا ہے اور انسانوں کے بجائے گھوڑوں اور کتوں سے پیار کرنے لگتا ہے۔ غدر کے زمانے میں ابن الوقت ایک انگریز نوبل کی جان بچاتا ہے۔ غدر کے بعد اسے اعلیٰ عہدہ مل جاتا ہے۔ وہ نوبل کی صحبت، انگریزی تعلیم اور اپنے عہدے کی وجہ سے بالکل مغربی طرز زندگی اختیار کر لیتا ہے لیکن نوبل کے جانے کے بعد دوسرے انگریز عہدیدار اس بات کو اپنی ہمدری سے تعبیر کر کے اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن حجۃ الاسلام کی وجہ سے یہ غلط فہمی دور ہوتی ہے اور ابن الوقت یہ محسوس کر لیتا ہے کہ مغربی تقلید میں ہندوستانیوں کی نجات نہیں ہے۔

اس ناول میں نذیر احمد نے انیسویں صدی کے سارے اہم

مسائل اور رجحانات سے بحث کی ہے۔ یہ ناول نذیر احمد کے دیگر ناولوں سے اس اعتبار سے منفرد اور امتیازی ہے کہ اس کے ذریعہ نذیر احمد کے سیاسی نظریہ سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سیاسی لفب العین اور مطمع نظر کو بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے اس غلامانہ ذہنیت اور تقلید کے خلاف زبردست طنز کیے ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں خصوصًا مصلحین میں پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی ناول کے ماحول اور کرداروں سے اس دور کی معاشرتی کشمکش کا پورا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں اس وقت کے سیاسی ماحول کے مناظر بھی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ معرض تحریر میں آگئے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، رعایا کے احساسات، سیاست اور مذہب کے نئے نئے تصورات اور ان کے زیر اثر ہندوستانیوں کے لیے تہذیبی و معاشرتی رجحانات جیسے موضوعات کو گفتگو اور مباحث کی صورت میں بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک حد تک مسلمانوں کو ہندو ذہنیت سے بھی واقف کرایا گیا ہے اور ان کے لیے ایک سیاسی لفب العین بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر علی عباس حسینی "حجۃ الاسلام بالکل نذیر احمد کے دل کے آدمی تھے"۔

ان کے تمام ناولوں میں اس زمانے کی مختلف سماجی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس زمانے کے سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے انیسویں صدی کی سوسائٹی کو پیش کرتے ہیں۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، ایامیٰ، رویائے صادقہ ان تمام ناولوں میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ناول اس دور کی معاشرتی زندگی کی تصویر، تفسیر اور تنقید ہیں۔ ان ناولوں میں واقعات اور معاشرتی حالات کے ساتھ افراد قصہ کی شخصیت و سیرت کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ نذیر احمد کے رجحانات اور تصورات تقریباً وہی تھے جو سرسید اور ان کے رفقاء کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اصل جذبہ و محرک قوم کی اصلاح اور ترقی کا خیال تھا۔ چناں چہ تمام ناولوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان کی مقصدیت ایک خاص دور کے تقاضوں اور تحریکوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں

مانتے ہیں لیکن محض اصلاح کا چکر ہے۔ میں ان
کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر
انھیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار
تسلیم کرتا ہوں۔" [1]

نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کی تصنیف سے لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ناولوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا حالی نے "مجالس النساء" لکھی۔ شاد عظیم آبادی نے "صورت الخیال" اور نواب افضل الدین احمد نے "فسانۂ خورشیدی" تصنیف کیا۔

حالی نے "مجالس النساء" کے نام سے ۱۸۷۴ء میں ایک کتاب لکھی اور اس کو نو مجالس یا ابواب میں تقسیم کیا۔ ہر مجلس میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے متعلق کسی ایک مسئلہ کے متعلق جس قدر بھی نصیحتیں عورتوں کو کی جا سکتی تھیں اور ان کی تربیت کی جا سکتی تھی حالی نے انھیں یکجا کر دیا ہے۔ وہ ان قصوں کی مدد سے اپنی کہانی میں معاشرتی زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک سادہ، اصلاحی اور مقصدی کہانی

---

[1] "ذوق ادب و شعور" از پروفیسر احتشام حسین ص ۳۵

ہے۔ قصہ پن کی بنیاد پر اسے ناول میں شمار کیا جانے لگا۔

شاد عظیم آبادی نے "صورت الخیال" کے نام سے ایک ناول تین جلدوں میں لکھا تھا۔ یہ بھی پند و نصائح پر مشتمل تھا۔ ان کا مقصد عورتوں میں حیرت و استقلال پیدا کرنا تھا۔ اس ناول میں اس زمانے کے حالات، کہ جب سفر اکثر پیادہ پا کیا جاتا تھا یا یکہ اور فیٹن کے ذریعہ، بہت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے صورت الخیال کا جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اپنی تصنیف کا مقصد صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"انسان کے دل پر جیسا اثر کسی عجیب و غریب افسانہ اور حکایتوں کا ہوتا ہے ویسا اثر کسی اور بات کا ہونا مشکل ہے۔ رنج و مصیبت یا عیش و عشرت کے مضامین سن کر مغموم و مسرور ہو جانا ایک فطری صفت ہے جو ہر ایک بشر کو دی گئی ہے۔ نصیحت کی کتابیں دنیا میں اس قدر موجود ہیں کہ اگر ان کے نام لکھے جائیں تو پوری ایک ضخیم کتاب ناموں ہی سے مرتب ہو سکتی ہے لیکن یہ امر انسانی خاصہ ہے کہ جب تک پند و نصائح کو حکایتوں کے ساتھ نہ ملایا جائے وہ دل میں اثر نہیں کرتیں۔ دیکھو قرآن مجید میں بھی کافروں کی الگ الگ حکایتیں ہیں جن میں اگلے صفحات

لیکن یہ بھی ایک انسانی خاصہ ہے کہ جب تک پند و
وعظ کے ساتھ تمثیلیں نہ ہوں تب تک جلدی سے
بات دل میں اترتی نہیں۔ دیکھو قرآن مجید میں بھی
جا بجا متقی و سعید، کافر و مومن، نیک و بد، سب
کی الگ الگ حکایتیں بیان ہوئی ہیں جن سے برائے
معلومات ضروری کے یہ کیا کم نفع ہے کہ آدمی کو کردار
زشت سے خوف و عبرت اور عمل نیک کی طرف
میلان و رغبت ہوتی ہے۔" [1]

نواب افضل الدین احمد نے ۱۸۷۹ء میں "فسانۂ خورشیدی" لکھا۔
اس کا مقدمہ ناول سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو عبدالغفور شہباز نے
لکھا ہے۔ مقدمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ نہایت تفصیل سے زبان کے پیچیدہ
رجحان کی مذمت کی ہے۔ فقہ کے ذریعہ زبان کو عام فہم، سلیس
اور لوگوں تک خیالات کو پہنچانے والی شے قرار دیا ہے۔ نذیر احمد
کے بعد ٹائپ کیریکٹر کو آگے بڑھانے والے افضل الدین احمد ہیں۔

---

[1] بحوالہ "اردو ناول کی تاریخ اور تنقید" از علی عباس حسینی ص ۱۸۵

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصانیف میں فسانہ آزاد

سیر کہسار، جام سرشار، خدائی فوجدار، طوفان بے تمیزی، چنچل نار

پی کہاں، کڑم دھم اور کامنی ہیں۔ فسانہ آزاد ان کا شاہکار ہے۔

اس میں داستانی رنگ نمایاں ہے۔ وقار عظیم کہتے ہیں۔

"سرشار کے متعلق یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ

انھوں نے اودھ اخبار کے لیے مضامین کا ایک سلسلہ

شروع کیا تھا ان مضامین کے ذریعہ وہ ہر روز

لکھنوی معاشرت اور تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو

کی تصویر کھینچتے تھے ان میں پڑھنے والوں نے خاص

قسم کا تنوع محسوس کیا اس لیے سرشار نے لوگوں کے

تقاضے سے ان منتشر تصویروں کو یکجا کر کے ایک

تصویر خانہ بنانے کی کوشش کی ہے یہ تصویر خانہ حد

درجہ دلکش اور دلفریب ہے لیکن اس کے گوناگوں

مرقعوں کا آپس میں کوئی ربط و تسلسل نہیں ہے۔

یہ تصویر خانہ "فسانہ آزاد" ہے" [1]

---

[1] "داستان سے افسانہ تک" از وقار عظیم ص ۶۵

فسانہ آزاد میں سرشار نے زندگی کی وسعت اور گہرائی کا احاطہ کیا ہے اور لکھنو کی پرانی تہذیب اور معاشرت کی عکاسی کی ہے جس میں ادنیٰ و اعلیٰ سوسائیٹی امراء اور روساء کے محل سراؤں کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں اور بازاروں کی رنگا رنگ زندگی کے مناظر کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس معاشرت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بقول سہیل بخاری

"وہ لکھنوی معاشرت کی برائیوں پر پردہ ڈالتے ہیں اور نہ ان کی خوبیوں کو ابھارتے ہیں وہ جیسا دیکھتے ہیں ویسا بیان کر دیتے ہیں اپنی طرف سے اضافہ نہیں کرتے" [1]

فسانہ آزاد کرداروں کا ایک البم ہے جس میں خوجی سب سے نمایاں ہے۔ خوجی کے کردار سے سرشار نے اس بے رحم صداقت کا اظہار کیا ہے جو نفسیاتی ہوتا ہے۔ خوجی لکھنو کے زوال آمادہ تہذیبی معاشرے کی علامت ہے۔ خوجی کی سب سے اہم خوبی وفاداری ہے یہ لکھنوی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ خوجی کے بارے میں پریم پال اشک لکھتے

---

[1] "اردو ناول نگاری" از سہیل بخاری ص ۵۹

ہیں ۔

"خوجی زوال آمادہ جاگیردارانہ تمدن کا خاص
کردار ہے جو مٹی ہوئی تہذیب اور معاشرت
پر کھلا طنز ہے اور ان لوگوں پر بھی پھبتی
ہے جو مذہب اور دھرم کی آڑ لے کر ہماری مٹی ہوئی
بوسیدہ کہنہ تہذیب کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے
ہیں اور نئی تہذیب کی قدروں سے روشناس
ہونے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔" [1]

خوجی کے علاوہ ہر کردار کا ایک انفرادی رنگ ہے بقول سید
لطیف حسین ادیب

"سرشار کے ناولوں سے اگر کردار علیحدہ کر دیئے
جائیں تو لطافت زبان کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں
رہتا۔ یہ کردار ہی ہیں جو فسانۂ آزاد جیسی بے ہنگم
تصنیف کو اپنے ستونوں پر روکے ہوئے ہیں۔" [2]

---

[1] "سرشار ایک مطالعہ" از پریم پال اشک ص ۱۳۳

[2] "رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری" از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ص ۱۶۲

انشا پردازی میں بھی سرشار اپنے ساتھیوں سے آگے نظر آتے ہیں۔

علی عباس حسینی کا خیال ہے کہ

"جہاں تک انشا پردازی اور اسلوب بیان
کا تعلق ہے بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول
نویسوں میں سرشار کے برابر کوئی کامیاب نہیں
ہوا۔" [1]

صفانہ آزاد کے تعلق سے ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کہتے ہیں

"سرشار اب کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں ایک طرف
انھوں نے قدیم قصّوں سے اکتساب فیض کیا پرانی
باتیں چھوڑ دیں نئی باتیں اپنائیں دوسری طرف
افسانے اور ناول کے لیے نئے نقوش، نئے اشارے
چھوڑے۔ ہر عہد میں تخلیق ہوتی ہے ہر فن کار جو
پروردگارانہ شان رکھتا ہے ایک ماضی اور ایک
مستقبل سے بے نیاز نہیں ہوتا ہے۔ سرشار بھی ان
ہی میں سے ایک ہیں۔" [2]

---

[1] "اردو ناول کی تاریخ اور تنقید" از علی عباس حسینی ص ۱۹۸
[2] "رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری" از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ص ۱۴۹

سرشار اپنے معاصرین میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں مشرقی طرز معاشرت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ حکمران قوم کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔ خود ہندو تھے لیکن لکھنؤ کی مسلم معاشرت اور تہذیب میں رچے ہوئے بھی تھے اور اس کے بہت اچھے مصور بھی۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں وہ سب کچھ پیش کیا ہے جس کے محرکات سرسید اور حالی کی تحریکات میں ملتے ہیں۔ اپنی تصنیفات میں ان کی نظر ایک ناقد اور مصلح کی ہے۔ ان کا مطمع نظر لکھنوی معاشرت اور خصوصیت سے عام ہندو مسلم طبقات کی پستی اور انحطاط کا مذاق اڑانا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ چناں چہ وہ دوسروں کی کمزوریوں کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر اس بات کو جو بے ضابطہ اور غیر پسندیدہ پرانے رسوم و خیالات پر مبنی ہو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی تصانیف مابعد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی معاشرت کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ فسانہ آزاد میں، جو ان کی لازوال تصنیف ہے زندگی کے عام مسائل اور موضوعات پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ یہ مسائل اس دور کے معاشرے کے بہترین ترجمان اور غماز تھے۔ اس میں ملکانوں کے زوال پذیر تمدن کے موثر اور

عبرت انگیز مناظر موجود ہیں۔

غرض فسانۂ آزاد اردو ناول کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا کیوں کہ لکھنؤ کا ایک خاص عہد اس کی بدولت زندہ ہے۔

شرر پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے بالارادہ ناول کے فن کو اردو میں برتا۔ شرر کو مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔ مسلمانوں کی عظیم تاریخ ان کے پیش نظر تھی اس لیئے وہ مسلمانوں کی بدحالی سے بے حد متاثر تھے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارنامے یاد دلاکر انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیئے عظمت ماضی کے واقعات کو انھوں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ چناں چہ ۱۸۸۸ء کے دلگداز میں جب "ملک العزیز ورجینا" چھپ چکا تو شرر نے اس کے خاتمہ پر یہ عبارت لکھی۔

"غالباً اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہیں۔" [1]

---

[1] "حاشیہ داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۱۷

شوقین ملکہ، منور موہنا، عزیز مصر، نلوا نلورنڈا وغیرہ شرر
کے تاریخی ناول ہیں۔ "فردوس بریں" ان کا شاہکار ناول ہے۔ یہ
ایک معاشرتی ناول ہے۔ اس کا پلاٹ بہت منظم اور واقعات کی
ترتیب دلکش ہے۔ منظر نگاری کے ذریعہ سے ماحول کی صحیح عکاسی
کی گئی ہے۔ بقول علی عباس حسینی

"مولانا شرر نے اس ناول میں سماں اور
منظر بھی بہت عمدہ طور پر دکھائے ہیں جس
مقام کو پر ہول بنانا ہو وہاں اس کی مناسبت
سے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں جنت کی
مرقع نگاری کی ہے وہاں قلم کا زور دوسری
ہی طرح کا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ فردوس
جسمانی لذات کا منبع ہے اور روحانیت کا مرکز
نہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا اس لیئے کہ
انسان کی تیار کردہ جنت میں خدا کی فردوس
کی شان کہاں؟" [1]

---

[1] "ناول کی تاریخ اور تنقید" از علی عباس حسینی ص ۲۴۳

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شرر کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اور انھوں نے مسلمانوں کی گھریلو معاشرت، شادی بیاہ اور مناظر قدرت کے اعلیٰ مرقعے پیش کیے ہیں۔ لیکن ان کی نظر نفسیات انسانی کی وسعت اور پیچیدگی پر نہیں گئی۔ ان کے مشہور ناول دلچسپ، دلکش، بدر النساء وغیرہ ہیں جن میں سماجی اور معاشی مسائل کو پیش کیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی اصلاح ممکن ہو۔ معاشرتی ناولوں میں "آغا صادق کی شادی" ایک کامیاب ناول ہے۔ اس میں شرر نے رسوم و رواج کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اور ساتھ ہی اخلاقی پہلوؤں اور گھریلو زندگی کی الجھنوں کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شرر نے مغربی فن کو مشرقی مزاج کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا اور اردو ناول نگاری میں ایک نیا تجربہ پیش کیا یعنی تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ بقول وقار عظیم

"شرر کے ناول کو ایک خاص قسم کے اصلاحی، تبلیغی، اور قومی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے فنی اور ادبی اقدار کا حامل

بنایا۔ فنی اقدار مغرب کے اثر کا نتیجہ تھیں اور
ادبی اقدار مشرقی مزاج اور مذاق کا عکس اور
پرتو۔ مشرقی مزاج اور مذاق کی تسکین کی خاطر
شرر نے نئے ناول کے لیے جو ادبی اقدار مہیا اور
یکجا کیے وہ اردو ناول کے لیے ایک مستقل
روایت بن گئی۔" [1]

اس طرح شرر کی ناول نگاری بھی سیاسی و معاشرتی پس منظر ہی کی رہین منت ہے۔ اسلام سے انھیں بے پناہ محبت تھی، تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اسی لیئے مذہبی جوش اور اسلام کے احیاء کا جذبہ ان کے ناولوں میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں سے پورے طور پر واقف تھے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ناولوں کی تخلیق کا مقصد انھوں نے یہ قرار دیا تھا کہ ان کے مطالعہ سے مسلمانوں میں حمیت اسلام جوش میں آئے۔ اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔

---

[1] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۷۷

محمد علی طبیب نے شرر کی تقلید میں تاریخی اور معاشرتی قسم کے ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں عبرت، حسن سرور دلیول دیوی، گورا، جعفر و عباس، اختر و حسینہ وغیرہ ہیں۔ حسن سرور میں عشق کی سرگرمیاں ہیں تو گورا میں عقد بیوگان کی وکالت۔ اختر و حسینہ میں تعلیم نسواں اور نارضامندی کی شادی کے نتائج وغیرہ پیش کیے گئے ہیں۔ پند و نصائح ان کے ناولوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ اپنے تاریخی ناولوں میں انھوں نے وہی کچھ پیش کیا ہے جو شرر کے ناولوں کا موضوع ہے جب کہ معاشرتی ناولوں میں اپنے دور کے بعض مسائل پیش کیے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناولوں میں تخیلی کرداروں کو جوڑ کر حقیقت نگاری کو بنیاد بنایا۔ اپنے ہی ملک (لکھنو) کی سرزمین پر اپنے پلاٹ قائم کیے اور کرداروں کے لیے اپنے گردوپیش کے اشخاص کا انتخاب کیا۔ کیوں کہ ناول کے لیے "حقیقت کا سہارا" اور "حقیقی سماج کا پس منظر" بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اندرسبھا میں رسوا نے لکھا ہے

"اگر ناول زندگی سے قریب ہونا چاہیے تو

اسے چاہیئے کہ وہ سماج کے حقائق سے وابستہ ہو۔" [1]

رسوا نے سماج کے حقائق کو اپنے ناول کے ذریعہ زندگی سے بہت قریب کر دیا ہے۔ انھوں نے داخلیت اور خارجیت کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے فرد اور سماج کے رشتے کی اس عمدگی سے پیش کیا ہے کہ اس کی مثال امراؤ جان ادا سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ یہ اردو کا پہلا نفسیاتی ناول ہے۔

ناول کے آغاز سے ہی لکھنؤ کی تہذیبی اور تمدنی زندگی جلوہ افروز ہونے لگتی ہے۔ ایک مشاعرہ میں قاری امراؤ جان ادا سے متعارف ہوتا ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ کی مجلسی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آنے لگتے ہیں۔ مشاعرے ہی میں رسوا کی ادا سے ملاقات کے بعد کہانی شروع ہوتی ہے۔

رسوا کے عہد میں طوائف سماج کا ایک حصہ بن چکی تھی جو عام گھریلو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ حسین، طرحدار اور تعلیم یافتہ ہوتی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت سے شرفاء اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اخلاق و آداب محفل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے انھیں طوائفوں کے یہاں بھیجتے تھے۔ امراؤ جان ادا میں طوائف کی زندگی ہی کو پیش

---

[1] "بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول" از یوسف سرمست ص ۹۱

نہیں کیا گیا بلکہ اس زوال پذیر معاشرے کی بھی عکاسی کی گئی ہے جہاں ہر شخص عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا تھا یہاں تک کہ جوان اور بوڑھے کی کوئی قید نہیں رہ گئی تھی۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام

"امراؤ جان ادا کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال ایک معاشرہ کا ہے جو اودھ کے چند شہروں تک محدود تھا۔ رسوا اس معاشرے کی تصویر دکھانا چاہتے ہیں۔ متوسط اور ادنیٰ متوسط گھرانوں کی اس تصویر میں پھوہڑ پن روایت پرستی، میاں سے اندھی محبت، عصمت پر زور، طوائفوں سے شدید نفرت اور گھر کی چہار دیواری میں اپنی حکومت کا تصور کتنی سچائی اور خوبصورتی کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آجاتا ہے۔" [1]

مرزا رسوا نے بھی سرشار کی طرح سے لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی مصوری کی ہے لیکن سرشار سے قطع نظر رسوا نے "امراؤ جان ادا"

---

[1] "تنقیدیں" از ڈاکٹر خورشید الاسلام ص ۱۱۵

لکھ کر پہلی مرتبہ ناول نگاری کی خصوصیات میں یہ اضافہ کیا کہ زندگی کے سیدھے سادھے معمولی اور بہ ظاہر غیر اہم مشاہدات کے پس منظر میں تہذیب، معاشرت، سیاست، معیشت اور بعض وقت تاریخ کے حقائق بھی موجود ہوتے ہیں۔ امراؤ جان ادا کے علاوہ رسوا نے افشائے راز، ذات شریف، شریف زادہ اور اختری بیگم بھی لکھے۔

"افشائے راز" میں بھی لکھنؤ کی شہری زندگی، وہاں کے باشندے اور ان کا سماجی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ "ذات شریف" میں بھی حقیقت نگاری کی کوشش نظر آتی ہے۔ شریف زادے میں ایک مثالی انسان کا کردار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو ذاتی محنت قابلیت اور نیک نفسی کی بدولت ترقی کرتے ہوئے ممتاز حیثیت کا مالک ہو جاتا ہے۔ "اختری بیگم" میں متوسط طبقہ کی زندگی کے نفسیاتی روابط دکھائے گئے ہیں۔ امراؤ جان ادا ان کا بہترین ناول ہے جس میں نگار خانے کے توسط سے لکھنؤ کے انحطاط پذیر تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔ امراؤ جان ادا کے نگار خانے سے فرار کے بعد اس زمانے کے غیر محفوظ راستوں، معاشرے کے شر پسند عناصر کی کارستانیوں، سیاسی بے تدبیریوں اور فوجوں کی کم ہمتی کی طرف واضح اشارے کیے

گئے ہیں ۔ اس کے کردار عام طور پر اپنے آپ کو اس مخصوص تمدن کا رکن ثابت کرتے ہیں ۔ اس تمدن کے افراد کے ذہن کھوکھلے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ۔ لیکن اس میں کچھ ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں جن میں اپنے طبقہ کے افراد سے کچھ مختلف احساس ہے ۔ اور ان میں جرات و حوصلہ کا عنصر بھی پایا جاتا ہے ۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امراؤ جان ادا اردو کا پہلا مکمل اور شاہکار ناول ہے ۔

اب تک ایسے ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ابتدائی دور یعنی انیسویں صدی میں لکھے گئے ۔ یہ تمام ناول اپنے دور کے نمائندے اور ترجمان سمجھے جاتے ہیں ۔

# دوسرا باب

## بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں خواتین کی ناول نگاری کا مختصر جائزہ

## اُردو کے اہم ناولوں میں معاصر زندگی ۱۹۴۷ء تک

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ناول نگاروں کی
ایک بھیڑ نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو رجحان سب سے
پہلے سامنے آتا ہے وہ مافی پرستی کا تھا۔ ویسے تو یہ رجحان انیسویں صدی
کی آخری دہائی میں تاریخی ناول نگاری کی صورت میں شروع ہو چکا تھا۔
اس رجحان کو ہم رومانوی رجحان بھی کہہ سکتے ہیں۔ مافی پرستی کے ساتھ
مشرقی روایات کے تحفظ کا رجحان بھی اس دور میں ایک علیحدہ رجحان
کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی روایت پر تنقید کا
رجحان بھی ناولوں میں نظر آتا ہے۔ روایت پر تنقید کے علاوہ نئی اور
پرانی تہذیب کے امتزاج پر بھی زور دیا جانے لگا۔ ان سب رجحانات
کے ساتھ قومی اور سیاسی مسائل کی پیشکشی کا بھی رجحان برابر کام کرتا
رہا۔ یہ تمام رجحانات خاص حالات کا نتیجہ تھے۔ ہندوستان میں
بے اطمینانی کی کیفیت میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا کیوں کہ دو مختلف
قوموں کی زور آزمائی پھر شروع ہو چکی تھی۔ ایک طرف انگریز ان کی
حکومت اور ان کی تہذیب تھی تو دوسری طرف ہندوستانی تھے اور ان
کی حکومت اور ان کا پورا تمدن تھا۔ ایسے نازک موقع پر ناول نگاری کے لیے

محرک یہی مسئلہ تھا کہ مختلف اور متفاد حالات میں کن چیزوں کو اختیار کرنا چاہیئے اور کن چیزوں کو چھوڑنا چاہیئے۔ کونسی باتیں سماج کے لیئے فائدہ مند ہو سکتی ہیں اور کونسی نقصان دہ۔ یہی سب باتیں ناول نگاری کا محرک مانی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ سائنس اور صنعتی ترقی نے بھی پرانے نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیئے ناول نگاروں کے سامنے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ پرانے نظام کی کونسی چیزیں ایسی ہیں جو محفوظ رکھی جانے کے قابل ہیں اور کونسی چیزیں ناکارہ اور فرسودہ ہو گئی ہیں جنھیں رد کر دیا جائے۔ اس بات کا جواب بھی ناول نگار ڈھونڈ رہے تھے۔ بقول رالف فاکس

"ناول نگار اسی بات کو پیش کرتا ہے جو اس کے عہد کی روح ہوتی ہے"۔[1]

اپنے زمانے کی یہی روح اس دور کی ناول نگاری میں نظر آتی ہے۔

اس دور کے اہم ناول نگار پریم چند، راشد الخیری، مرزا محمد سعید نیاز فتحپوری، کشن پرشاد کول وغیرہ ہیں۔ اس دور میں تعلیم نسواں کے نتیجے کے طور پر خواتین میں بھی مسائل کو نسائی نقطہ نظر سے سمجھنے اور پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔

---

[1] بحوالہ "بیسویں صدی میں اردو ناول" ڈاکٹر یوسف سرمست ص ۱۵۶

بیسویں صدی کے آغاز سے خواتین بھی ناول نگاری کی
طرف متوجہ ہوئیں۔ وقار عظیم کا یہ خیال صحیح ہے کہ "خواتین کے ناول
بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے نہیں ملتے۔"[1] نذیر احمد اور راشد الخیری
کی اصلاحی انداز فکر جو اس دور کے لیے مخصوص ہو چکی تھی زہرہ یا مشیر
نسواں (۱۹۰۶ء) سے لے کر نذرت آرا بیگم (۱۹۴۲ء) تک نظر آتی ہے۔
جیسا کہ بیگم شاہنواز کے ناول "حسن آرا" میں اصغری کی طرح حسن آرا
اچھی تعلیم و تربیت کی وجہ سے گھر کو سنبھال لیتی ہے۔ ضیاء بانو کے تمام
ناول فغان اشرف، انجام زندگی اور فریب زندگی بالکلیہ طور پر راشد الخیری
سے متاثر ہیں۔ محمدی بیگم کی "شریف بیٹی" بھی راشد الخیری کی شریف
لڑکیوں کی طرح ہر مصیبت سہتی ہے لیکن باپ دادا کی عزت پر آنچ آنے
نہیں دیتی۔ ان کے دوسرے ناول "آج کل" اور "صفیہ بیگم" ہیں۔ "آج کل"
کا مقصد آج کے کام کو کل پر نہ ٹالنے کی تلقین کرنا ہے۔ اور "صفیہ بیگم" میں
بچیوں کی شادی کے خطرناک نتائج پیش کیے گئے ہیں۔ ان ناولوں کے
علاوہ بہت سے ایسے ناول بھی لکھے گئے جو نذیر احمد اور راشد الخیری کی
تقلید نہیں کرتے۔ نذیر احمد مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام کی

---

[1] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۱۰۴

بجا آوری کو ناممکن سمجھتے تھے اور لاشعوری مغربی تہذیب کے اختیار کرنے کو مذہب سے بیگانگی اور اخلاق سے بیگانگی سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ خواتین ناول نگار جو، ان کی تقلید نہیں کرتیں وہ مغربی تہذیب کے ساتھ مشرقی قدروں کو بھی اپنانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ یہ رجحان صغریٰ ہمایوں کے ناول زہرہ یا مشیر نسواں سے لے کر "روشنک بیگم" تک سبھی کے پاس نظر آتا ہے۔ "زہرہ" میں انگریزی طرز پر آراستہ مکان ملتے ہیں اور ساتھ ہی یہ تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ کسی قوم کے رسم و رواج کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ اس کے ہنر سیکھنے چاہیئے۔ انھوں نے اپنے دوسرے ناول "سرگذشت ہاجرہ" میں مغرب اور مشرق کے امتزاج کو اپنے کردار کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے۔

"آداب مجلس و آداب سوسائٹی مشرقی اور مغربی دونوں طریقوں سے تمہاری ماں نے تم کو ماہر کرا دیا ہے۔"[1]

نذر سجاد حیدر کی اختر النساء اور زیادہ ترقی پسند ہے۔ وہ انتہائی ظلم

---

[1] "سرگذشت ہاجرہ" از صغریٰ ہمایوں مرزا ص ۶

وستم برداشت کرتی ہے لیکن جب اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو
وہ فرضی نام سے تعلیم بھی حاصل کرتی ہے اور ملازمت بھی کرتی ہے۔
مغربی تہذیب کے ساتھ مذہب پر کاربند رہنے کی تلقین
بھی ان ناولوں میں ملتی ہے۔ نذر سجاد حیدر کے دوسرے ناول "لجنہ"
میں تین خاندانوں کی زندگی کا تقابل کرکے مغرب زدگی اور دقیانوسی
انداز اختیار کرنے کے خطرناک نتائج بتائے گئے ہیں۔ مغربی تہذیب
کے ساتھ مذہبی احکام کی پابندی ان کے ہاں نصب العین کی حیثیت رکھتی
ہے۔ اس کے علاوہ نذیر احمد کے زمانے سے توہمات کو ختم کرنے
کی جو کوشش کی جارہی تھی اس کے اور غیر ضروری رسم و رواج کے
خلاف بھی خواتین ناول نگاروں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اس
طرح مشرقی انداز کے ساتھ مغربی تہذیب کی اہمیت کو ظاہر کرکے ان
دونوں تہذیبوں کی کشمکش میں خواتین نے ان دونوں تہذیبوں
کے امتزاج کی ضرورت پر زور دیا۔ اس سماجی مسئلہ کا تعلق چوں کہ
ان کی عام گھریلو زندگی سے تھا اس لیئے انھوں نے اپنی روزمرہ کی
گھریلو زندگی میں اسے دیکھا اور دوسروں کو دکھایا ہے۔ اس لیئے ان
ناولوں میں زندگی کا کوئی وسیع پس منظر نہیں ملتا۔ اس بارے میں

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں۔

"یہ ناول خواتین کی گھریلو زندگی اور سماجی رجحانات
کے اچھے عکاس تھے..... ظاہر ہے کہ ان کا
ماحول ہوٹلوں، بازاروں اور عشق و عاشقی کے
بکھیڑوں کا نہیں ہو سکتا تھا۔" [1]

اس طرح اپنے آپ کو ایک مخصوص دائرہ میں محدود رکھنے کی وجہ سے خواتین کی ناول نگاری میں حقیقت اور واقعیت ملتی ہے۔ اور اسی حقیقی عکاسی کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز نظر آتی ہیں۔

ان میں سب سے پہلے نذر سجاد حیدر کا نام آتا ہے۔ انھوں نے کئی ناول لکھے جن میں اختر النساء، آہ مظلوماں، حرماں نصیب اور جانباز قابل ذکر ہیں۔

طیبہ بیگم نے اپنے ناولوں میں اپنی معاشرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مولوی عبدالحق نے ان کے ناول حشمت النساء اور الوری بیگم کے متعلق لکھا ہے۔

---

[1] "اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ" از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ص ۱۰۷

"ان دونوں ناولوں میں انھوں نے حیدرآباد
کی معاشرت کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ الوری بیگم
کے قصہ میں اور ترقی کی ہے جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اُس زمانے میں معاشرت اور خیالات
میں کیا کیا تغیرات ہوئے ہیں۔ لائق مصنفہ
نے اپنی سوسائٹی کو غائر نظر سے دیکھا ہے۔
پرانے توہمات، تعصبات اور خیالات کو
بالتوں باتوں میں بڑی خوبی سے بیان کیا
ہے"۔ [1]

"شوکت آرا بیگم" جو خالون (مسز عباس طیب جی) کا لکھا ہوا ہے متوسط طبقہ کی زندگی اور اس کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ حمیدہ سلطان محفی دہلوی کا ناول "ثروت آرا بیگم" میں بھی خواتین کی معاشرتی اور گھریلو زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان خواتین نے ملک اور قوم کی سیاسی بیداری سے واقفیت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ نذر سجاد حیدر کا ناول "جانباز" وطن پرستی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس کی ہیروئن

---

[1] مقدمہ "الوری بیگم" ص ۸، ۹ بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست

عملی طور پر اس وقت کی سیاست میں حصہ لے کر ملک کی جدوجہد آزادی میں شامل ہو جاتی ہے۔

اس طرح خواتین ناول نگاروں نے سماجی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی مسائل بھی پیش کیے۔ لیکن بحیثیت مجموعی سماجی اور معاشرتی زندگی ہی ان کی ناول نگاری کا موضوع رہی ہے۔

حقیقت پسندانہ اظہار بیان کرنے والوں میں حجاب امتیاز علی اور صالحہ عابد حسین بھی قابل ذکر ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے تین ناول عذرا، آتش خاموش اور قطرے سے گہر ہونے تک لکھے۔ حجاب امتیاز علی نے "ظالم محبت" اور "اندھیرا خواب" لکھے۔ "عذرا" میں بھی مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کا تقادم ملتا ہے۔ اس ناول میں گھریلو زندگی میں شادی بیاہ کے موقع پر رسموں کی جو اہمیت ہے وہ بھی ملتی ہے اور گھر کی چہار دیواری سے باہر گلی کوچوں، شاہراہوں میں جو سیاسی نعرے گونج رہے ہیں ان کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ عذرا کے علاوہ "آتش خاموش" اور "قطرے سے گہر ہونے تک" میں ناول نگار نے ایسے موضوع اختیار کیے ہیں جو نہ صرف ان کی نظر میں اہم ہیں بلکہ ان کی اہمیت اس زمانے کے معاشرے کے لیے مسلّم ہے۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں جو اہم ناول نگار گزرے ہیں ان میں مولانا راشد الخیری کثیر التصانیف تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد ان کے پیشوا تھے۔ ان کو مصورِ غم اور محسن نسواں کا بھی خطاب دیا گیا۔ ان کے مشہور ناول بنت الوقت، جوہر قدامت، عروس کربلا، سیدہ کا لال، صبح زندگی، شام زندگی ہیں۔ ان کے فن کی بنیاد نذیر احمد کی دی ہوئی اس روایت پر ہے جس کا آغاز مراۃ العروس اور بنات النعش سے ہوا۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ نذیر احمد عورتوں کی اصلاح چاہتے تھے اور راشد الخیری نے اس کی اصلاح کے ساتھ اس کی معاشرتی حیثیت کو بھی بلند کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ مغرب زدگی کو روکنا چاہتے ہیں اس طرح وہ مشرق اور مغرب کی تہذیبی کشمکش کو ظاہر کرتے ہوئے مشرقی تہذیب کی پاسداری بھی کرتے ہیں کیوں کہ اس دور میں مغربی تمدن کی وجہ سے مذہب سے بیگانگی بڑھتی جارہی تھی اور مولانا کے خیال میں مذہب سے بیگانگی کے بعد کوئی بھی ترقی تنزل سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مشرق کی ہر چیز کو سراہتے ہیں۔ انھوں نے متعدد تاریخی ناول بھی تصنیف کیے۔ ان کے تاریخی

ناولوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایسے ہی تاریخی موضوعات اور کردار منتخب کیے جن کے ذریعہ مسلمان خواتین کے کارنامے پیش کیے جا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو بھی اپنے دیگر معاشرتی اور اصلاحی ناولوں کی طرح عورتوں کے افادہ کے لیے ہی تصنیف کیا۔

مرزا محمد سعید نے دو ناول لکھے۔ لیکن انھوں نے اردو میں پہلی مرتبہ زندگی کے مسائل کے بارے میں ڈوب کر لکھا۔ مرزا محمد سعید راشد الخیری کے برخلاف مغربی تہذیب میں خوبیاں بھی دیکھتے ہیں مگر ان خوبیوں کے ساتھ ان کی نظر اس کی برائیوں پر بھی رہتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے ناولوں میں اس رجحان کو پیش کرتے ہیں جو اپنے اندر مغرب اور مشرق کی بہترین خصوصیات کو جذب کر لینا چاہتا تھا۔ ان کی ناول نگاری ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس سال انھوں نے اپنا پہلا ناول "خواب ہستی" لکھا۔ "خواب ہستی" میں مرزا محمد سعید نے اپنے زمانے کے معاشرتی انتشار کو واقعات کی شکل میں واضح کرنے پر توجہ دی ہے۔ ان کی نظر زمانے کے اس انتشار و اضطراب پر ہے جس میں سیاست، معیشت اور تہذیب سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں اس سے فرار کی صورت میں انسان کی فطرت آزادی کے حصول کا مطالبہ

کرتی ہے۔ وہ آزاد ہونے کے لیئے ہاتھ پیر مارتا ہے اور اس طرح اپنی قید کو اور زیادہ مستحکم کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ انتشار و اضطراب کی یہ کیفیت مستقل بن جاتی ہے۔ ان کا دوسرا ناول "یاسمین" ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا۔ "یاسمین" میں انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہندوپاک کے معاشرتی بحران کو موضوع بنایا ہے۔ ان ناولوں میں سماجی حالات کے تغیرات اور فرد کی کشمکش کو بڑی ہی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ فرد اور سماج کی اس کشمکش سے اس تہذیبی امتزاج کا نقشہ ابھرتا ہے جو بیسویں صدی کے پہلے دہے سے ہندوستان میں اپنے قدم جما رہا تھا۔

نیاز فتحپوری کے ناول "ایک شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگذشت" ہیں۔ انھوں نے ادب لطیف قسم کے ناول لکھے۔ "ایک شاعر کا انجام" جوانی کے ہیجانات اور اضطراب سے لبریز ہے جس میں ربط بالکل نہیں اور قصہ بے سروپا ہے۔ اس کے برخلاف ان کا دوسرا ناول "شہاب کی سرگذشت" ایک سنجیدہ ناول ہے اس کا مقصد محبت اور ازدواج کو بیگانہ دکھانا ہے۔ اس میں انھوں نے ازدواجی زندگی کے اہم مسئلہ کو اٹھایا ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آخر وہ

چاہتے کیا ہیں۔ لوگ شادی کریں یا نہ کریں اور کریں تو کس سے کریں؟

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں نئی اور پرانی اقدار کی کشمکش میں جہاں چند اقدار کو برقرار رکھنے کے لیے اور ان میں امتزاج پیدا کرنے کے لیے راشد الخیری اور مرزا سعید جیسے ناول نگار جدوجہد کر رہے تھے وہیں ان قدروں سے بیزارگی اور ان سے بغاوت کا رجحان بھی پرورش پا رہا تھا۔ اصل میں رومانوی تحریک اس باغیانہ رجحان کی نشاندہی کرتی ہے جس میں اپنی حقیقی دنیا سے بیزارگی اور اس کو بدل دینے کی خواہش ہوتی ہے جو تخیل کے ذریعہ پوری کر لی جاتی ہے۔ نیاز کی ناول نگاری سے پہلے نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک کئی ناول نگار مسلسل سماجی اور سیاسی پس منظر کو پیش کر رہے تھے۔ اصل میں اس وقت کی دنیا کو بدلنے کی کوشش ہر ایک اپنے طور پر کر رہا تھا۔ ان میں سے کچھ حقائق کو دیکھ کر، ان کو پیش کر کے اس دنیا کو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعض صرف تخیل اور خیال کے زور پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہے تھے۔ رومانوی تحریک کے اکثر ادیب دوسرے ممالک کے بہتر حالات اور نئے خیالات کو دیکھنے میں ایسے منہمک تھے کہ ان کی نظر اپنے سیاسی اور سماجی حقائق سے بڑی حد تک بیگانہ ہو گئی

تھی۔ نیا ر بھی انگریزی ادیبوں کا اثر قبول کر رہے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں سیاسی یا سماجی پس منظر ابھر کر نہیں آتا۔

اس دور کے ایک اور اہم ناول نگار کشن پرشاد کول ہیں۔ انھوں نے دو ناول لکھے "شیاما" اور "سادھو اور بہیوا"۔ رومانی بغاوت کے وہ رجحانات جو نیاز فتحپوری کے ہاں ملتے ہیں ان کے یہاں ناول "شیاما" میں ایک واضح صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ناول میں بھی مذہب اور سماج سے بیزارگی ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ بیزارگی ٹوٹس سماجی حقائق کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی کشن پرشاد کے اس ناول کا انداز رومانی ہے یہاں بھی بس ایک جذباتی آرزومندی ملتی ہے جو رومانی تحریک کے ادیبوں کا امتیازی وصف ہے۔

"شیاما" میں مسز اینی بسنٹ کی گرفتاری اور ان کی سماجی اور سیاسی خدمات کا بھی ذکر ہے۔ اس ناول کا پس منظر اس زمانے کی سیاسی، سماجی اور املاکی سرگرمیاں ہیں۔ ناول کا مقصد ہندوستانی سماج اور خاص طور سے ہندو سماج میں عورتوں پر جو بیجا قسم کی سماجی اور مذہبی بندشیں ہیں ان کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں اخلاقی اقدار ن
طرح بدل رہے تھے یعنی پرانے تمام اعتقادات پھینک دیئے گئے تھے
اور ان کی جگہ ابھی پر نہیں ہوئی تھی۔ "شیاما" میں یہ رجحان پوری
طرح ملتا ہے: "شیاما" اس سوشیل نظام کے خلاف اپنی آواز بلند
کرتی ہے اور اس کی باغیانہ روح سماج کی ان زنجیروں کو توڑ پھینکنا
چاہتی ہے کیوں کہ ان ہی زنجیروں نے اس کی زندگی میں زہر گھول
دیا تھا۔ شیاما کی یہ بغاوت صرف ذہنی حیثیت اختیار کر لیتی ہے
یہ ذہنی بغاوت وہ صرف سماج اور مذہب ہی سے نہیں کرتی بلکہ
سیاسی طور پر بھی وہ باغیانہ خیالات رکھتی ہے۔ سیاسی طور پر بھی
باغیانہ خیالات رکھنے کے باوجود اس کی یہ بغاوت سماج اور
مذہب سے ہوتی ہے چوں کہ اس زمانے میں یہ بھی ایک مسئلہ تھا کہ
سماجی اصلاح کو سیاست پر ترجیح دی جائے یا سیاست کو سماجی
اصلاح پر۔ جیسا کہ "شیاما" کا ایک کردار کہتا ہے

"یہ تو بڑا اہم مسئلہ ہے کہ پالٹیکس کو سوشیل رفارم
پر ترجیح دی جائے یا اس کے برعکس۔" [1]

---

[1] "شیاما" کشن پرشاد کول ص ۱۴۲

لیکن "شیاما" سماجی اصلاح کو سیاست پر ترجیح دیتی ہے اور یہی

ہے۔

"پہلے آپ اپنی قوم کی حالت سنبھالیئے پھر آزادی کے

خواہاں ہوئیے"۔ [۱]

اس لیئے اپنے آخری خط میں وہ سماج اور مذہب پر کڑی تنقید کرتی

ہے اور چاہتی ہے کہ

"دھرم شاستر کی پرانی مریادا کو بالائے طاق رکھ

کر قانون میں اس طرح ترمیم ہونی چاہیئے کہ مرد

صرف ایک شادی کر سکیں اور دوسرے عورتوں کو

بھی دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہو"۔ [۲]

اس طرح "شیاما" میں سماجی مذہبی اور سیاسی موضوعات سے بحث

کی گئی ہے جس طرح سماجی اور مذہبی بندشیں انسانی شخصیت پر

اثر انداز ہوتی ہیں ان میں اور انسان میں جو کشمکش ہوتی ہے اس

کو فنکارانہ طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔

---

[۱] "شیاما" از کشن پرشاد کول ص ۱۲۸

[۲] "شیاما" از کشن پرشاد کول ص ۱۸۱

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں اردو ناول نگاری عہد
نو کے فنی اور فکری تقاضوں سے روشناس ہوئی اسی دور میں پریم
چند بھی ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ وہ بلاشبہ ان لوگوں
میں سے تھے جن کے ناولوں سے اردو ادب میں ناول کے فن نے
اعتبار پایا۔ پریم چند نے ناولوں کا مواد اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے
سے حاصل کیا اور ناول کو حقیقی عصری اور معاشرتی زندگی سے قریب
تر کر دیا۔ پریم چند پہلے ناول نگار ہیں جن کے یہاں دیہاتی زندگی
پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے ۔ بقول رشید احمد صدیقی

"اردو ناول لکھنے والوں میں پریم چند پہلے شخص
ہیں جنھوں نے حسن و عشق کو محل سراؤں اور
مشاعروں سے نکال کر گاؤں کی چوپال اور
کھیتوں تک پہونچا دیا" [1]

ان کا پہلا ناول "اسرار معابد" ہے ۔ یہ ناول اکتوبر ۱۹۰۲ء سے
فبروری ۱۹۰۵ء کے درمیان بنارس کے ہفتہ وار اخبار
"آواز خلق" میں قسط وار چھپ کر مکمل ہوا۔ ان کا دوسرا ناول

---

[1] دیباچہ "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر قمر رئیس ص ۱۱

"ہم خرما و ہم ثواب" ۱۹۵۸ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد جلوہ ایثار، پردہ مجاز، غبن، نرملا، بیوہ، میدان عمل، منگل سوتر اور گئودان مختلف وقتوں میں ان کے سال وفات ۱۹۳۶ء تک شائع ہوتے رہے۔ ابتدائی ناولوں میں ہندو معاشرے کے مخصوص مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ قریب سے کیا اور جو کچھ انھوں نے محسوس کیا اسے پوری صداقت کے ساتھ پیش کر دیا تاکہ لوگ اس دور کے حالات سے باخبر ہو سکیں اور ایک بہتر سماج کی تعمیر کر سکیں۔

پریم چند روسی ناول نگاروں سے متاثر نظر آتے ہیں مثلاً ٹالسٹائی اور گورکی جیسے روسی ناول نگاروں سے پریم چند کی مماثلت کی اصل وجہ انقلاب سے پہلے کے روس اور تحریک آزادی سے قبل کے ہندوستانی مزدوروں اور کسانوں کے حالات اور سماجی مسائل میں پائی جانے والی یکسانیت ہے۔ حالاں کہ ان دونوں کی طرح انھوں نے بھی سماج کے اندھے اصولوں، فرسودہ رسوم و رواج اور پامال انسانیت کے علاوہ تحریک آزادی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا لیکن وہ مقام حاصل نہ کر سکے جو گورکی

اور ٹالسٹائی کو روسی ادب میں ملا ۔ ممتاز حسین کہتے ہیں

"اس معاملہ میں خط امتیاز صرف اتنا کھینچا جا سکتا

ہے کہ ٹالسٹائی نے ایک پیغمبر کا روپ دھارا لیکن

پریم چند کے یہاں ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔" [1]

حالاں کہ حقیقت نگاری کی ابتداء پریم چند سے پہلے ہو چکی تھی۔

لیکن پریم چند نے اسے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ گئودان میں اس

کی بہترین مثالیں ملتی ہیں یہ ان کے آخری دور کا شاہکار ہے۔

بقول پروفیسر مسعود حسین خاں

"گئودان قطرۂ شبنم کی طرح اپنے اندر ایک

مکمل دنیا رکھتا ہے۔" [2]

ملک میں تحریک آزادی، مغربی تعلیم اور ۱۹۱۷ء میں لینن کی

قیادت میں روسی انقلاب کے اثرات نے ناول کے لیے کافی مواد

فراہم کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں یہ کئی روایات سے روشناس ہوا

جن میں عمری و سیاسی حالات کے تحت سیاسی آزادی اور قومی بیداری

---

[1] "ادب و شعور" از ممتاز حسین ص ۲۷۷

[2] بحوالہ "پریم چند شخصیت اور کارنامے" مرتب ڈاکٹر قمر رئیس ص ۱۳۱

کے لیئے کافی گنجائش پیدا ہوگئی تھی۔ اس رجحان کو پریم چند نے بھی قبول کیا اسی لیئے "پریم چند نے مقصد پسندی کو اپنا دین ایمان بنالیا تھا"[1] پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پریم چند عدم تعاون کی تحریک کے زیر اثر ملازمت سے استعفیٰ دے کر تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔ اس کی بازگشت ان کے ناولوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ جوں جوں تحریک آزادی میں شدت آتی گئی پریم چند مہاتما گاندھی کے قریب ہوتے گئے اور ان پر گاندھی واد کا رنگ چڑھتا گیا۔ گوشہ عافیت، بازار حسن اور میدان عمل میں گاندھی واد کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس طرح مہاتما گاندھی کے خیالات کو تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچانے میں پریم چند کے ناولوں نے اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے جس معاشرتی نظام کا تصور پیش کیا اس کا انحصار سماجی اور معاشی مساوات اور پس ماندہ طبقہ کی فلاح و بہبود پر ہے۔ لیکن پریم چند اپنی زندگی کے آخری ایام میں گاندھی واد سے منحرف نظر آتے ہیں۔ اور اشتراکیت اور حقیقت نگاری کی جانب زیادہ راغب دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی ان پیچیدگیوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جو اس دور کی تلخ حقیقتیں تھیں۔

---

[1] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۸۴

"میدان عمل" اور "گئودان" میں ان ہی سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان میں حقیقت نگاری کے ساتھ انقلابی شعور بھی ملتا ہے۔ سردار جعفری لکھتے ہیں۔

"انھوں نے اس زندگی اور سماج سے اپنی کہانیاں، ناولوں کے کردار اور موضوع حاصل کیے اور اسے تبدیل کرنے اور بہتر بنانے کے لیے ادب سے کام لیا۔ ان کرداروں میں نہ نفسیاتی الجھنیں ہیں اور نہ جنسی امراض کے شکار نوجوان۔ ان کے یہاں کچلے ہوئے انسان ہیں جو بہتر انسان بننے کے خواہش مند ہیں"۔ [1]

اپنے ناولوں میں انھوں نے ساہوکاروں کی مکاری، رشوت خوری غریب کسانوں کی روایت پرستی اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو بڑی صداقت اور خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر قمر رئیس

"جہاں تک زندگی کی مصوری کا تعلق ہے

---

[1] "ترقی پسند ادب" از علی سردار جعفری ص ۱۲۹

پریم چند کا ہر ناول بے لاگ ہے وہ اپنے

عہد کی زندگی کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں

کہ ہم ان کے آئینہ میں ہندوستان کی تیس

سالہ سماجی اور سیاسی زندگی کی تاریخ کا

مطالعہ کر سکتے ہیں۔" [1]

پریم چند کے ناولوں میں جیتا جاگتا ہندوستان ملتا ہے کیوں کہ انھوں نے اسے دیہات کے لہلہاتے کھیتوں میں دیکھا اور محسوس کیا ہے اور پھر اسے حقیقی روپ میں پیش بھی کیا ہے۔ یوسف سرمست کے الفاظ میں

"پریم چند اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی

حالات سے براہ راست وابستہ رہے ہیں

پریم چند نے ساحل سے طوفان کا نظارہ

نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفانوں کے تھپیڑے

بھی کھائے ہیں۔" [2]

پریم چند کا زمانہ ان کے پیش روؤں کے مقابلے میں ناول کے فنی ارتقاء

---

[1] "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر قمر رئیس ص ۵۳۰

[2] "بیسویں صدی میں اردو ناول" از ڈاکٹر یوسف سرمست ص ۲۷۰

کے لیے بہت سازگار تھا۔ نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ تہذیبی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک نئی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ پریم چند نے ان تمام پیچیدگیوں کا بغور مطالعہ کیا اور بڑے سلیقہ سے انھیں اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ انھوں نے اس عہد کے عام انسانوں کو ان کے مسائل کے ساتھ سماجی اور معاشی بدحالی کے آئینہ میں دکھلایا۔ اس طرح ہندوستانی معاشرے کے ایک ایک پہلو کو موضوع بنایا۔ "بیوہ" میں بال بیوہ کی دوسری شادی کا مسئلہ ہے۔ "بازارِ حسن" میں جہیز اور بے میل شادی کے نتائج ہیں۔ "جوگانِ ہستی" میں آزادی کے جذبہ سے بھرپور نوجوانوں کا جوش و خروش ہے۔ بہ الفاظ دیگر تحریک آزادی کو موضوع بنایا گیا۔ پردۂ مجاز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں جھگڑے کے تباہ کن نتائج دکھائے ہیں۔ "نرملا" اور "غبن" وغیرہ میں ہندوستانی عورت اپنے مختلف مسائل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اور آخر میں "گئودان" میں غریب کسان کی دکھ بھری داستان ہے۔

اس طرح پریم چند نے اپنے ناولوں میں زندگی کے ہر گوشے کی تصویر کشی کی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے پریم چند کے بارے میں کہا ہے

"اردو ادب میں پریم چند سے زیادہ

## ہندوستانی کوئی اور ہندوستانی ناول نگار

## نظر نہیں آتا" [1]

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی ناول نگاری کا دور ہندوستان کی سیاسی، سماجی زندگیوں کی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں دو تمدنوں اور تہذیبوں کے تضاد اور تصادم کی وجہ سے رونما ہوئی تھیں اسی وجہ سے ناول نگاری کے اس عہد میں بڑے متضاد اور متصادم قسم کے رجحانات ملتے ہیں۔ چوں کہ نئے حالات اور نئے خیالات کی وجہ سے نئی اور پرانی قدروں میں شدید کشمکش جاری تھی۔ اس دور کے ناولوں میں قدروں کی یہ کشمکش اور تبدیلی واضح طور پر نمایاں ہے۔ اس عہد کے ناول نگاروں نے قدروں کی ان تبدیلیوں کو ظاہر کرکے ایک نئے شعور کو تیار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی وسطی دہائیوں کے ابتدائی دس سالوں کی ناول نگاری میں ہم کو ایک نئے ذہن اور نئے شعور کا احساس ہوتا ہے۔ جو ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد ناول نگاری میں ایک شدید صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ابتدائی بیسویں صدی سے ۱۹۳۶ء تک کی اردو ناول نگاری کا یہ عہد پریم چند کی ناول نگاری میں پوری طرح نمایاں ہے۔

---

[1] "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر تمر رئیس ص ۱۱

۱۹۳۶ء کے بعد جس نئی نسل نے ناول اور افسانے کو
اپنا موضوع بنایا وہ پریم چند کے مقابلے میں جدید تر ذہن، سائنٹی فک
اور احساس تازہ کے مالک تھے۔ ان کے ذہن و شعور کی تعمیر میں اگر
ایک طرف مارکس اور اشتراکی سرمایہ ادب تھا تو دوسری طرف
فرائڈ اور ڈی۔ ایچ لارنس اور جیمس جوائس جیسے مفکر اور
ادیب تھے۔ ان کے نظریات اور ادب سے ہر ادیب نے اپنے کردار
اور مزاج کی مناسبت سے استفادہ کیا۔ انھوں نے فرد اور سماج کے
بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھتے ہوئے سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کے
کردار اور اس کے تجربات پر زور دیا۔ اس طرح اردو ناول میں
تحلیل نفسی اور داخلی حقیقت نگاری کی تازہ لہر پیدا ہوئی۔ اس
دور میں ادب نے اجتماعی زندگی کی ترجمانی کا بیڑا اٹھایا۔ اس
دوران اس میں پروپگنڈہ بھی آگیا مگر ہمارا ادب نسبتاً زیادہ
سچا اور جاندار ہو گیا۔ ادب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور
جنسیات کے نازک مسائل بھی اس کے دائرے میں آگئے۔ اس دور
کے ناول نگاروں نے فرد کی داخلی کشمکش، محرومیوں، اعصابی
ہیجان اور روحانی کرب کو قریب سے دیکھا۔ یہی بات ہم کو

سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" میں نظر آتی ہے۔

گئودان کے بعد لکھا جانے والا اہم ناول "لندن کی ایک رات" ہے۔ یہ ناول ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا۔ اس کے دیباچہ میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

"یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیئے۔ اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے اب میں اس مسودہ کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر ایک مخصوص جذباتی کشمکش سے دوچار ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں

انسانوں کے ساتھ رہنا اور ان کے دل کی
دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس
قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ میں
اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔" [1]

اس ناول میں ایک نسل کے طلباء کے ذہنی انتشار کی عکاسی کی گئی ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ساری دنیا میں پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں

"سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعہ
ہندوستان کے متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے
نوجوانوں کی عکاسی کی ہے۔ اس طرح انھوں
نے اس دور کے سیاسی و تہذیبی مسائل کو اپنا
موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں جو تصویریں
ہیں وہ دھندلی سی ہیں اور معلوم ہوتا ہے یہ
ذہنی اور جذباتی کشمکش ابھی ابتدائی منزل ہے۔" [2]

---

[1] دیباچہ "لندن کی ایک رات" از سجاد ظہیر

[2] "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۴۷

یہی وجہ ہے کہ اس ناول کے سارے کردار انتشار اور بے چینی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنی مرضی اور ذہنی کاوشوں کی بناد پر زندگی کا آغاز کرنے کے خواہاں ہیں۔

اس ناول کا موضوع اس اعتبار سے بالکل نیا ہے کہ اس میں ان ہندوستانی طلبار کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جو برطانوی حکومت کے دور میں انگلستان بہ غرض تعلیم گئے تھے۔ اور انھیں وہاں مغربی تہذیب کے جگمگاتے ہوئے مناظر اور سرمایہ دارانہ نظام کے تقاضوں سے بیک وقت سابقہ پڑتا تھا۔ سجاد ظہیر نے اس ناول میں پہلی بار شعور کی رو کی تکنیک کو جزوی طور پر لیکن کامیابی اور تخلیقی مہارت کے ساتھ برتا۔

عزیز احمد کا شمار اردو ناول کی تاریخ میں ممتاز ناول نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کا پہلا ناول "ہوس" ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے "مرمر اور خون" لکھا۔ یہ دونوں ناول فن کے اعتبار سے نہایت ناقص ہیں۔ ان کی شہرت کا آغاز ان کے ناول "گریز" سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی حقیقت نگاری کا دور آیا۔

اور ادب برائے زندگی پر زور دیا جانے لگا تاکہ ادب کو عوام سے قریب تر کیا جاسکے۔ بقول سردار جعفری

"ہمارا ادب عوامی ادب بنے۔ اس جدوجہد کی کئی سطحیں ہیں۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ ہم ماضی کی اقدار اور روایات کا از سر نو جائزہ لیں اور ان میں ان قدروں اور روائتوں کو اپنائیں جو صحت مند ہیں اور آج کی جدوجہد اور زندگی کی تعمیر میں کام آسکتی ہیں اور ان قدروں اور روائتوں کو ترک کریں جو بیمار اور فرسودہ ہیں اور ادب اور سماج کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں"۔ [1]

عزیز احمد اس تحریک میں سب سے آگے نظر آتے ہیں انھوں نے فرائڈ کے نظریات کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں "گریز دراصل سجاد ظہیر کی لندن کی ایک رات کی ارتقائی شکل ہے"۔ [2]

---

[1] "ترقی پسند ادب" از سردار جعفری ص ۲۲۸

[2] "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۵۱

001480

Indira Gandhi Memorial Library
University of Hyd-134

"گرہن" کی کہانی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کے پر آشوب دور کی کہانی ہے جس میں معاشی بدحالی اور جنس کا غلبہ نمایاں ہے۔ یہ ناول پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عہد کے سیاسی اور معاشی ماحول کا ایک منتشر ترجمان ہے۔ جسے پڑھ کر وہ سیاسی اور معاشی محرکات سامنے آتے ہیں جو یورپ کے زیر اثر اس وقت کے عالمی مسئلے تھے۔ اس ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی نفسیات کا بھی سہارا لیا گیا ہے جو دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کی زندگی کے انقلابات پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے مرکزی کردار کو انگلستان کے دوران قیام میں پہلی بار نسلی امتیاز اور اپنی سیاسی محکومی کا شدید احساس ہوتا ہے وہ اپنی انتقامی حرکتوں سے فراریت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس میں پورے یورپ اور اس کی سیاسی و اقتصادی و جنسی اقدار کو ایک ہندوستانی کے نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار حکومت کا کارندہ تو ہے لیکن باطنی طور پر مضطرب اور غیر مطمئن۔

"گرہن" کے بعد "ایسی بلندی ایسی پستی" کو عزیز احمد کا دوسرا اہم ناول کہا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کے

اعلیٰ طبقہ کی زندگی کو پیش کیا ہے جہاں دولت، شہرت اور نائٹ کلب ہی سب کچھ ہیں۔ جہاں مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کی جاتی ہے۔ اکثر عیش و نشاط کی محفلیں جمتی ہیں اور دیگر دوسری لعنتیں جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہیں اس معاشرے میں صاف نظر آتی ہیں۔ جہاں لوگ ہندوستانی ہونے کے باوجود بھی مغربیت اپنا رہے ہیں۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی

"ایسی بلندی ایسی پستی جاگیردارانہ نظام کی داستان ہے جو زوال آمادہ ہے اور جس کی زندگی اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ یہ ناول حیدرآباد (دکن) کے ماحول کو پیش کرتا ہے اور ان خاندانوں کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کی سطحیت اور انحطاط کو بے نقاب کرتا ہے جو بظاہر سوسائٹی میں علم و ادب اور اخلاق و تہذیب کے وارث سمجھے جاتے ہیں۔"[1]

اس طرح "ایسی بلندی ایسی پستی" حیدرآباد کی مٹتی ہوئی تہذیب کی حقیقی تصویر ہے۔

---

[1] "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۵۲

کرشن چندر کا شمار ادب میں عام طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے ناول بھی لکھے۔ اپنے ناولوں میں انھوں نے وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جو ترقی پسند تحریک کا تھا۔ ان کے ناولوں میں خلوص اور زندگی کی حقیقت واضح طور پر ملتی ہے۔ ان کی ناول نگاری کا انداز رومانی ہے۔ ان کے ناولوں میں ہر سوسائٹی کے کردار اپنے مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے ناولوں کا مواد روزمرہ کی زندگی سے حاصل کیا ہے اسی لیے زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ ان کے ناولوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کوئی ناول دوسرے کے مماثل نہیں ہوتا۔ ان کا ہر ناول ایک منفرد انداز رکھتا ہے۔ ان کا پہلا ناول "شکست" ہے جو ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا۔ اس کے بارے میں عزیز احمد کا خیال ہے کہ

"... غالباً وہ اردو کا بہترین ناول ہے" [1]

"شکست" میں دورِ جدید کے انتشار، بے چینی اور کرب کو پیش کیا گیا ہے۔ پرانی اقدار کی تبدیلی کی وجہ سے نوجوانوں کے ذہنوں

---

[1] "ترقی پسند ادب" از عزیز احمد ص ۱۷۸

اور خیالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کا اظہار
نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اس بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں

"شکست نئے دور کے انتشار، ایک نئی اور
دلکش دنیا کی تلاش و جستجو کا ترجمان ہے۔
شکست میں فرد کے ذہن اور اس کے گرد
و پیش کے ماحول کا اضطراب فطرت کی
حسین دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے"۔ [1]

ناول کا ہیرو شیام، وشنی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کی
ماں برادری سے نکالی ہوئی ہے اسی لیے شیام کی شادی وشنی
سے نہ ہو سکی۔ وشنی کی شادی کسی اور جگہ ہو جاتی ہے۔ لیکن
جب شیام کی شادی ہوتی ہے تو وشنی یہ غم برداشت نہیں
کر سکتی کہ اس کا محبوب کسی اور کا ہو جائے۔ اس غم کی تاب نہ لا کر
وشنی موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ چندرا ایک اچھوت لڑکی ہے
موہن سنگھ جو راجپوت ہے سے محبت کرتی ہے وہ سماج کی پرواہ
نہیں کرتی۔ کہتی ہے

---

[1] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۸۸

"برادری جائے چولہے میں ۔ بھاڑ میں ۔

برادری نے ہمیں کون سا سکھ پہنچایا ہے جو

میں اس کی خدمت کرتی پھروں ۔" [1]

لیکن اچانک موہن سنگھ کی موت ہو جانے پر اس کی تاب نہ لاکر وہ پاگل ہو جاتی ہے ۔ ناول کے مقصد کی نشاندہی کرتے ہوئے کرشن پرشاد کول رقم طراز ہیں کہ

"ناول کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو

تفریق ذات کی پابندیوں اور امیری اور

غریبی کے فرق کی وجہ سے مختلف فرقوں

اور طبقوں کے لوگوں میں شادی بیاہ کا

ہونا ممکن نہیں ۔ جس سے فی زمانہ اچھے

اور شریف لڑکے اور لڑکیوں کی زندگیاں

تباہ ہو جاتی ہیں ۔ باوصف باہمی محبت اور

اختلاط کے شادی کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا

اس کے تباہ کن نتائج کو ناظرین پر ظاہر

---

[1] "شکست" از کرشن چندر ص ۱۱۶

کر کے ان کے دلوں پر اثر ڈالا جائے تاکہ

سوسائیٹی کے برے رسم و رواج سنبھل

سکیں اور ایسی پابندیاں ٹوٹ سکیں۔" [1]

"شکست" کے تمام کردار اپنے ماحول اور واقعات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ شیام تعلیم یافتہ نوجوان ہے ونتی سے محبت بھی کرتا ہے لیکن سماج سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ یہ اپنے دور کے نوجوانوں کی صحیح عکاسی کرتا ہے جو بہ ظاہر ذہنی طور پر جذباتی ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں لیکن بغاوت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس ناول میں دراصل نئی اور پرانی قدروں کے تصادم کو پیش کیا گیا ہے کہ نوجوان نسل میں ابھی اتنی ہمت اور طاقت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ پرانی قدروں کی زنجیروں سے خود کو آزاد کرا لیں۔ اور فرسودہ سماجی بندشوں کو توڑ پھینکیں۔ اسی المیہ کو کرشن چندر نے کشمیر کے حسین مناظر میں اپنے مخصوص اور تیکھے انداز سے پیش کیا ہے۔

---

[1] "نیا ادب" از کشن پرشاد کول ص ۲۷۲

رالف فاکس کہتا ہے

"ناول نگار اپنے اشخاص کی نجی سرگذشت
نہیں لکھتا جب تک کہ اس کے سامنے اس
کی ایک مکمل تحریر نہ ہو جسکا جزو وہ
خاص اشخاص ہیں۔ اس کے کردار مسلسل
باہمی ٹکراؤ سے جو آخری نتیجہ نکلتا ہے
اس کا تصور اس کے ذہن میں واضح ہونا
چاہیئے اور اس کے لیئے ان پیچیدہ اور
نو بہ نو حالات زندگی کا شعور ناگزیر
ہے جو اس کردار کو ایک انفرادی آب و
رنگ بخشتے ہیں" [1]

ان خیالات کی روشنی میں "شکست" فنی اعتبار سے ایک کامیاب ترین ناول قرار پاتا ہے۔

عصمت چغتائی کے ناولوں میں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، دل کی دنیا، سودائی اور ایک قطرہ خون شامل ہیں۔

---

[1] "کہانی اور اس کا فن" ایس انتخاروف مترجم مغنی تبسم ص ۳۸

ترقی پسند تحریک نے ان کی بصیرت کو بے باکی عطا کی ۔ زندگی کے عناصر مطالعہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کی کمزوریوں کو بھی بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔

"ضدی" ان کا پہلا ناول ہے ۔ اس ناول میں زندگی کا کوئی خاص پہلو اجاگر نہیں ہوتا ۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کی عزت و آبرو کے تصورات پر طنز کیا گیا ہے ۔ عصمت کا شاہکار ناول "ٹیڑھی لکیر" ہے ۔ یہ ناول ۱۹۴۷ء میں چھپا ۔ اس ناول میں انھوں نے ایک ایسی لڑکی کی روئداد بیان کی ہے جو قدیم اور جدید کے درمیان جھول رہی ہے ۔ عصمت چغتائی نے ایک ایسے دور کی کہانی کہی ہے جس میں قدیم تہذیب دم توڑ رہی تھی اور نئی تہذیب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے ۔ مسلم متوسط گھرانوں میں پردہ کا چلن ختم ہو رہا تھا ۔ حالاں کہ ابھی مرد اور عورتوں میں میل جول زیادہ تو نہ تھا لیکن عورتیں مردوں کے برابر درجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ اس ماحول میں عصمت چغتائی نے شمن کا کردار ترتیب دیا جو ناول کا مرکزی کردار ہے جس نے ہمیشہ سماج سے بغاوت کی لیکن انسانی فطرت سے بغاوت نہ کر سکی ۔ اس لیئے شمن کے کردار کی لکیر سیدھی

ہونے کے بجائے ٹیڑھی ہوگئی ۔ اس کے کردار کا یہ موڑ عصمت چغتائی کی وسیع فکر و نظر کا پتہ دیتا ہے جس میں سماج اور معاشی الجھنوں کے ساتھ جنسی الجھنیں بھی ہیں۔ اس ناول میں نفسیاتی الجھنوں سے گھرے ہوئے کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ماحول کس طرح آہستہ آہستہ فرد کی زندگی میں نفسیاتی انقلاب پیدا کر دیتا ہے ۔ مختصر یہ کہ "ٹیڑھی لکیر" اپنے مواد و کردار اور حالات کے اعتبار سے ہمارے سماج کی حقیقی تصویر ہے۔ اس کے کرداروں کے ذریعہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بچوں کی زیادتی کے نتیجہ میں گھر والوں کا پھوہڑپن، کام کی بے ترتیبی اور بے ہنگم طریقہ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ بقول وقار عظیم

"عصمت نے اپنے ذاتی مشاہدات کو گہرے
فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر مکمل طور پر
قاری کے مشاہدات بنا دینے کا کام جس طرح
"ٹیڑھی لکیر" میں انجام دیا ہے اب تک کوئی
عورت ناول نگار انجام نہیں دے سکی تھی۔" [1]

---

[1] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم ص ۱۲۶

پنڈت کشن پرشاد کول "ٹیڑھی لکیر" کو عصمت چغتائی کا شاہکار

قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں

"جس طرح سے پریم چند کا گئودان ان کا

شاہکار کہا جا سکتا ہے اس طرح "ٹیڑھی لکیر"

عصمت چغتائی کا شاہکار ہے۔ پریم چند نے

گئودان میں ہمارے یہاں کی دیہاتی زندگی کی

مکمل تصویر کھینچ کر اس کی ترجمانی کر کے جس

طرح اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا

ہے اسی طرح "ٹیڑھی لکیر" میں ہمارے

یہاں کی ماڈرن گرل کا مکمل نقشہ کھینچ کر

عصمت چغتائی نے اردو میں ایک نئے

باب کی تخلیق کی ہے جس کے لیئے ہمیں ان

کا احسان مند ہونا چاہیئے۔"[1]

الغرض "ٹیڑھی لکیر" اردو ناول کے اس تاریخی ارتقاء کی اہم کڑی

ہے جسے رسوا، پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر اور عزیز احمد نے

---

[1] "نیا ادب" از کشن پرشاد کول ص ۲۵۴

آگے بڑھایا۔ جس میں زندگی کو غور و فکر کے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔

بقول عبدالقادر سروری

"کہانی کہنے اور رلف کے ساتھ کہانی کہنے کا
انھیں سلیقہ ہے۔ زندگی کے انوکھے پہلو وہ
اپنے موضوعات کے لیے منتخب کر لیتی ہیں
متوسط اور نچلے طبقوں کے مصائب اور
خاص طور پر عورتوں کی زندگی کے آلام
کو پیش کرتی ہیں۔ وہ سماج کے من مانے
نظام پر بڑے گہرے طنز بھی کرتی ہیں۔
ناول "ٹیڑھی لکیر" اس عہد کے عمدہ
ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔"[1]

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ناولوں میں موضوع، ماحول اور مقصد کے اعتبار سے جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں اس میں ماحول کے سیاسی اور معاشی محرکات ناولوں کا امتیازی وصف ہیں۔ لیکن پریم چند کے بعد ناول نگاری کے مقابلے میں

---

[1] "اردو کی ادبی تاریخ" از عبدالقادر سروری ص ۲۷۷

افسانہ نگاری نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ محض چند ناول نگاروں نے بہترین شاہکار پیش کیے۔ اس دور کے نمایاں ناول نگار سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی ہیں۔ ان کے ناول ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراب کا عکس ہیں۔ اس دور میں سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" کرشن چندر کی "شکست" عزیز احمد کی "گریز" اور عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" فرد کی الجھنوں سے گھرے ہوئے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ تمام ناول اپنے دور اور عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملے جلے سیاسی، معاشی اور معاشرتی محرکات کے حامل اور عکاس ہیں۔ ان میں ماحول کے سیاسی اور معاشی تقاضوں کا بھرپور اظہار ہے اور ان عوامل و محرکات میں فرد کے کردار کی تشکیل و تعمیر کا جائزہ بھی ان ناولوں کا مقصد ہے۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی عہد سے ہی اردو ناول کا رشتہ سماج سے قائم ہو گیا تھا اور یہ بڑی حد تک اپنے عہد کے سماج کی عکاسی کرنے لگا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدائی دور سے ۱۹۴۷ء تک کے اردو

ناول میں سماجی شعور اور تاریخی بصیرت کی جھلکیاں یقیناً ملتی ہیں۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا، پریم چند اور راشد الخیری کے ناولوں میں اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ ان میں کہیں گہرائی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں جسے نئی سماجی حقائق کی روشنی میں تنظیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں فرسودہ ماضی پر طنز کا انداز کارفرما ہے تو کہیں اصلاحی نشاۃ الثانیہ کے جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کہیں فطرت انسانی کے مطالعے کے ساتھ اس بکھرتے ہوئے سماج کے مختلف طبقات کی تصویریں پیش کی گئی ہیں اور کہیں عام شہری زندگی کے ساتھ دیہاتی زندگی کے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ کہیں ہندوستانی طلبا کی ذہنی کیفیت اور الجھنیں ہیں اور کہیں نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش میں ہندوستانی عورت کی بے بسی۔ ذات پات کی تفریق اور بے جا روایت پرستی اور متوسط طبقے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں بالخصوص اس کی گھٹن کا تذکرہ بھی نئے انداز سے کیا گیا ہے۔ ان سب کا مقصد زندگی کی تفسیر و تنقید تھا۔ اس طرح یہ سب ناول ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ہندوستان کے متوسط طبقے کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کا عکس واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔

# تیسرا باب

## ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا سرسری مطالعہ
## ملک کی تقسیم
## ادب پر تقسیم کے اثرات

کسی ملک یا قوم کی تاریخ میں حکومت سے
آزادی حاصل کر لینا کوئی منفرد اکائی کی حیثیت کا حامل واقعہ
نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں ایک طویل جد و جہد کارفرما
ہوتی ہے۔ اس جد و جہد میں کچھ ایسی قوتیں بھی شامل رہتی ہیں جو
آزادی کے ملنے کے بعد بھی ملک کے حالات پر اثر انداز ہوتی رہتی
ہیں۔ ہندوستان میں بھی آزادی ملنے کے فوری بعد کے حالات
(تقسیم ہند) کا جائزہ لینے کے لیئے ان سماجی و سیاسی عوامل کا مطالعہ
ضروری ہے جو ہمارے ملک میں آزادی سے پہلے کارفرما تھے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ان کی
حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ قوم کے اتحاد و اتفاق، یکجہتی
و ہم آہنگی کو کچھ نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ یورپی طرز فکر
اور تہذیب و تمدن نے ہندوستانی معاشرت کو بڑی حد تک
متاثر کیا۔ قومیت کے یورپی تصور نے ایک طرف ہندوستان
میں مضبوط و مستحکم قومیت کے جذبات کی نشو نما میں مدد دی
لیکن دوسری طرف انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیئے یہاں کے

باشندوں بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعصب اور
عداوت کا بیج بو دیا۔

محل شہنشاہ فرخ سیر کا فرمان جس کی رو سے
انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں بغیر مال گذاری اور
محصول دیئے آزادانہ کاروبار کرنے کا حق اور ہندوستان کے دوسرے
علاقوں میں تجارتی مراعات دی گئی تھیں۔ دراصل یہی وہ واقعہ
تھا جس کو ہم صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی کے خاتمہ کی ابتدا
کہہ سکتے ہیں۔ ۱۷-۱۷۱۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ درحقیقت
انگریزوں کے ہندوستان کی سیاست پر مکمل طور پر چھا جانے
کا زمانہ ہے۔ اس وقت سے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے
یعنی ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ ہندوستان میں برطانوی نظم و نسق کے
استحکام، مختلف سماجی اصلاحات، انگریزی تعلیم کے رواج،
قومی بیداری، قومیت پرستی، سیاسی جماعتوں کے قیام اور
ان کے عروج، مذہبی بنیاد پر فرقہ وارانہ تنظیم، سیاسی تحریکوں،
مطالبہ مکمل آزادی اور تقسیم ملک کے مطالبہ کا زمانہ ہے۔
مئی ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے

پر بہ ظاہر ہندوستان میں سکون کی فضا قائم تھی مگر یہ سکون عارضی تھا۔ دوران جنگ ہندوستانی کرپس مشن کی ناکامی بھی دیکھ چکے تھے اور قحط بنگال (۱۹۴۳ء) سے بھی واقف تھے۔ اس سکون کی تہہ میں ایک طوفان پوشیدہ تھا۔ اس میں حکومت برطانیہ پر "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک (۱۹۴۲ء) کو کچل دینے کی وجہ سے غصہ بھی شامل تھا اور سیاسی جماعتوں کی باہمی رقابتوں، آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کے مقدمے اور حکومت اور سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی قابل قبول حل نہ نکلنے کی وجہ سے عام بے چینی بھی تھی۔ ان سب سے زیادہ اہم بات ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانیہ کے وقار میں کمی کا احساس تھا جو جنگ کے دوران سنگاپور اور برما میں برطانوی شکست کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس سکون کے زیر پردہ ہندوستانی عوام میں آزادی حاصل کرنے کا جوش اور بھرپور خود اعتمادی تھی۔

اگرچہ اس دوران برطانیہ میں بھی ایک اطمینان کی کیفیت تھی لیکن وہ جنگ کے دوران برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبہ آزادی کی شدت جیسے ہندوستان چھوڑ دو

تحریک، آزاد ہند فوج کا قیام اور جاپانیوں کے ساتھ ہندوستانیوں کا لڑنا بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ جنگ کے خاتمے تک دنیا میں قومی، نسلی اور اقتصادی آزادی کے خیالات فروغ پانے لگے تھے۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنھیں برطانوی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر وائسرائے ہند لارڈ ویول نے جون ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس بلائی تاکہ وائسرائے ہند کی کونسل کی نئی تشکیل پر ہندو اور مسلمان دونوں فریقوں میں کوئی سمجھوتہ ہو سکے اور ہندوستان کی مکمل آزادی کی طرف ایک اور قدم اٹھایا جا سکے۔ لیکن یہ کانفرنس ناکام رہی۔ اس کی ناکامی کے کچھ ہی دنوں بعد جولائی ۱۹۴۵ء میں لیبر پارٹی عام انتخابات کے ذریعہ برسر اقتدار آگئی۔ ہندوستان میں سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیئے اس جماعت نے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے نئے انتخابات وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کی ہندوستانی ممبران پر مشتمل تشکیل جدید اور انتخابات کے بعد جلد از جلد مجلس آئین ساز بلائے جانے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں انتخابات ہوئے جس میں عام نشستوں کے لیئے انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمانوں کی مخصوص

نشستوں کے لیئے مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ مسلم لیگ کے امیدواروں کی کامیابی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تقسیم کا مطالبہ مسلمانوں میں شدت اختیار کر گیا تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے انداز فکر میں اس اختلاف کے پیدا ہونے کی مختلف وجوہات ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو کانگریس کے وہ اقدامات ہیں جو اس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت آٹھ صوبوں میں وزارت سنبھالنے کے بعد کیئے۔

"مسلمان کانگریس کے ساتھ ہر صوبہ میں مشترکہ وزارت (Coalition Ministry) بنانا چاہتے تھے لیکن کانگریس نے وزارت میں ایسے لوگوں کو شریک کرنے سے انکار کر دیا جو اس کے عقیدے میں یقین نہ رکھتے ہوں۔"[1] ۱۹۳۷ء کے انتخابات کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کی اتنی نمائندہ جماعت نہیں تھی جتنا عام طور پر بتایا جاتا ہے۔ کانگریس نے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور نہ اس نے مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی اہمیت

---

[1] بحوالہ "اردو ادب آزادی کے بعد" از ڈاکٹر محمد زاکر

کو محسوس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریس کے صوبوں میں وزارتیں سنبھالنے کے بعد خود "قوم پرور مسلمانوں کو یہ شکایت ہوئی کہ ان کو بہت کم جگہیں ملیں۔ اس سے زیادہ اہم مسلمانوں کی یہ شکایت تھی کہ کانگریس حکومت نے ان کے تہذیبی حقوق پامال کر ڈالے۔"[1] اسمبلیوں کی کاروائیاں "وندے ماترم" سے شروع کی جانے لگیں اور سرکاری دفاتر پر کانگریسی جھنڈے لہرائے جانے لگے۔ کانگریس حکومتوں نے کانگریس کی اس پالیسی پر جس کا وہ باضابطہ اعلان کر چکی تھی کہ ہندوستانی زبان کو دیوناگری اور فارسی دونوں خطوں کے ساتھ قومی زبان بنایا جائے گا کئی صوبوں میں عمل نہیں کیا گیا اور عام طور پر اردو کو دبانے کی کوشش کی گئی[2]۔ یو۔پی کے سرکاری اسکولوں میں اردو کے بجائے ہندی کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا۔ یہ سب وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کی طرف سے بدظنی پھیل گئی اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے ساتھ فرقہ وارانہ تفریق پسندی بھی ان میں بڑھنے لگی۔

---

[1] "قومی تہذیب کا مسئلہ"، ڈاکٹر سید عابد حسین ص ۲۵۳

[2] " " " ص ۲۵۴

یہاں تک کہ جناح نے ایسے بیانات دینے شروع کر دیئے کہ

"آئینی تصفیہ اس بنیاد پر ہونا چاہیئے کہ

ہندوستان ایک قوم نہیں بلکہ دو قوموں

پر مشتمل ہے۔ مسلمان کسی بھی ثالثی فیصلے

کو نہیں مانیں گے بلکہ اپنی قسمت کا فیصلہ

خود کریں گے" [1]

بقول عابد حسین "یہ تفریق پسندی دراصل ایک تہذیبی مسئلہ تھا" [2]

جس سے سیاسی رہنماؤں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس تفریق پسندی

کے رجحان کا پتہ لگانے کے لیے ہندوستان میں قومیت پرستی کی تاریخ

پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

جوں جوں قومیت پرستی اور قومی شعور بڑھتا گیا

ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی اپنی شوکت پارینہ کا خیال آنے لگا اور

احیاء پسندی کے رجحانات بڑھنے لگے۔ اس طرح تفریق کی ایک خلیج

دونوں کے درمیان پیدا ہو گئی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے

---

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۱۷۳

[2] "قومی تہذیب کا مسئلہ" ڈاکٹر عابد حسین ص ۲۴۴

ہی سے مسلمانوں میں باطنی تعلیم اور دینی شعور کے احیاء کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے وسط اور اواخر میں قرآن شریف کا فارسی ترجمہ (شاہ ولی اللہ ۱۷۶۳ء) ولی اللہی تحریک اور بعد میں قرآن شریف کے اردو ترجمے ۱۷۷۶ء میں شاہ رفیع الدین صاحب کا اور ۱۷۹۵ء میں شاہ عبدالقادر صاحب کا مسلمانوں میں اسلامی عقائد پختہ کرنے کی کوششیں ہی تھیں جن کا عملی نتیجہ سکھوں کے خلاف جہاد اور منزلی پنجاب اور سرحد کے علاقے میں ایک شرعی اسلامی حکومت کے قیام (۱۸۲۵ء) کی صورت میں سامنے آیا۔

سلطنت مغلیہ کا خاتمہ، انگریزی حکومت کے عتاب اور انگریزی تعلیم کو دیر سے اپنانے کی وجہ سے مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں مادی اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ اس لیے انیسویں صدی ہی سے ہندوؤں کی برطانوی حکومت کی نگاہ میں وفاداری قائم کرنے اور ان کے ملک کی معیشت اور نظم و نسق میں بڑھتے ہوئے عمل دخل کی وجہ سے مسلمانوں میں ان سے علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا ہونے لگے تھے۔ اور پھر انیسویں صدی میں جدید تحقیق کی وجہ سے قدیم ہندوستانی تہذیب کا انکشاف

ہونے کے نتیجہ میں ہندوؤں میں اصلیت کے رجحانات میں
تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ اس صدی کے بنگالی ادب میں مسلمانوں
کو "Yavana" کے نفرت انگیز لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور
حکومت کی تقسیم بنگال کی پالیسی اور بنگال میں سودیشی تحریک اور مسلمانوں
کے ان پر ردعمل کے بعد سے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف
اس خیال سے جو کدورت پیدا ہو چکی تھی کہ ایک زمانے میں مسلمانوں
نے ان پر حکومت کی ہے اب بڑھنے لگی۔ اس طرح دونوں فرقوں
میں تفریق کی یہ خلیج بڑھتی ہی گئی اس کو دور کرنے کے لیے کوئی
اقدامات نہیں کیے گئے بلکہ اقلیتی فرقہ کے تحفظ کے طور پر مختلف قوانین
کے ذریعہ ملک کی اسمبلیوں، سرکاری اداروں اور ملازمتوں میں
مذہب کی بنیاد پر نمائندگی کا اصول قائم کر دیا گیا۔

ان حالات میں حکومت برطانیہ نے مارچ ۱۹۴۶ء
میں ایک کیبنٹ مشن روانہ کیا جو تین ماہ ہندوستان میں قیام کرنے
اور ہندوستانی رہنماؤں سے گفت و شنید کرنے کے بعد ۱۶ مئی کو
اپنی تجاویز پیش کر دے۔ اس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ایک مجلس
دستور ساز کا انتخاب کیا جائے جو ایک ہندوستانی یونین کا دستور وضع

کرے جس میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات وفاقی مفامین رہیں۔ اس منصوبے کا فیصلہ زیادہ تر کانگریس کے نقطہ نظر کے مطابق تھا اس لیے اس میں سارے ملک کے لیے ایک ہی آئین ساز اسمبلی اور مستقل وفاق تجویز کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی لیگ کے اس مطالبہ کو بھی ملحوظ رکھا گیا تھا کہ مجوزہ وفاق میں یونین کے اختیارات کم سے کم اور صوبوں کے زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اور صوبوں کو یہ اختیار ہو کہ اگر چاہیں تو مکمل ایک جماعت بنا سکیں اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ درمیانی عرصہ کے لیے ایک عبوری حکومت جسے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو فوراً بنائی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ نے ۶/جون ۱۹۴۶ء کو منصوبہ منظور کر لیا اور ۲۶/جون کو کانگریس نے بھی اس منصوبے کا دستوری حصہ منظور کر لیا لیکن عارضی حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا اس پر حکومت نے لیگ کو بھی دعوت نہیں دی اور وائسرائے نے سرکاری حکام پر مشتمل ایک نگران حکومت مقرر کر دی۔ اس مرحلہ پر لیگ نے مشن کی تجاویز کو قبول کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا اور برطانیہ کے خلاف اپنے غصہ کا اظہار کرنے کے لیے ۱۶/اگست کو یوم احتجاج

منانے کا اعلان کر دیا۔ ( Direct Action day )

اور یہ بھی اعلان کیا کہ عام انتخابات میں چنے گئے اس کے نمائندے مجلس آئین ساز میں شرکت نہیں کریں گے۔ لیکن ۱۸ر جولائی کو کانگریس نے عبوری حکومت میں شامل ہونے کی تجویز منظور کر لی اور محض کانگریس کے نمائندوں اور وائسرائے کے نامزد ممبران پر مشتمل عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ ابتداء میں مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا مگر بعد میں اس میں شریک ہو گئی مگر مجلس آئین ساز میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ بدستور قائم رہا۔ اس دوران فرقہ وارانہ فسادات کا وہ سلسلہ جو ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ مسلم لیگ کے یوم احتجاج کو کلکتہ سے شروع ہوا تھا آہستہ آہستہ ردعمل کے طور پر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلتا گیا۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے وائسرائے اور دوسرے سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو ۲۷ر نومبر ۱۹۴۶ء کو لندن بلایا مگر مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو حکومت برطانیہ نے یہ اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت برطانیہ ہندوستان سے اپنا اقتدار ہٹا لینا چاہتی ہے۔

مارچ میں لارڈ ماونٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر
بھیجا گیا۔ عہدہ سنبھالنے کے تین ماہ کے اندر ہی لارڈ ماونٹ بیٹن
نے حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان کو خود مختاری
اور تقسیم ہند کے لیے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ مقرر کر دی جائے۔
یہ مشورہ منظور کر لیا گیا۔ ہندوستان کے رہنماؤں سے مذاکرات
کرنے کے بعد وہ مئی میں لندن روانہ ہو گئے اور واپسی پر
۲/ جون کو اپنی تجویز پیش کر دی۔ جس کی رو سے مسلم اکثریت
کے صوبوں کو جن کے نمائندے آئین ساز اسمبلی میں شریک
نہیں تھے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا کہ ان کا آئین چاہے
موجودہ آئین ساز اسمبلی بنائے چاہے کوئی اور نئی اسمبلی۔ ۳/ جون
کو دونوں جماعتوں نے اس پلان کو منظور کر لیا۔ گویا تقسیم ہند
کے فیصلے کا اعلان کر دیا گیا۔ ۴/ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ
میں ہندوستان کی آزادی کا بل پیش ہو کر ۱۵/ جولائی کو قانون
بن گیا۔

اس طرح ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کی
صورت میں آزادی جلوہ گر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وحشت،

بربریت اور قتل و غارت کی ایک ایسی آندھی اٹھی جس نے پنجاب اور بنگال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ۱۷ اگست کو سرحد بندی کمیشن کے فیصلے (Rad Cliffe Award) کا اعلان کیا گیا تو فرقہ وارانہ کشت وخون کی آگ اور بھڑک اٹھی اور پنجاب کے حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ حالانکہ پچاس ہزار فوجی جوانوں پر مشتمل ایک سرحدی فوج یکم اگست کو ہی قائم کی گئی تھی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیوں کہ اس کے ممبران نے اپنے اپنے ہم مذہبوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ پنجاب کے لیے تبادلہ آبادی کا فیصلہ ہوا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا اس تبادلہ آبادی سے متاثر ہونے والوں کی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا محض مذہب کے نام پر لوگوں کو دو نئے ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ باہمی لطف و عناد جو ایک عرصہ سے فرقہ پرست لوگوں کے دلوں میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اچانک ابل پڑا اور لوگوں کا امن و سکون بہا لے گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء سے مئی ۱۹۴۸ء تک ایک کروڑ چالیس لاکھ ہندو، مسلمان اور سکھوں کو اپنے گھروں

سے بے گھر ہونا پڑا - چھ لاکھ آدمی مارے گئے اور ایک لاکھ
لڑکیاں اغوا کی گئیں - اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ
ہندوستان کو آزادی بہت جلدی میں دی گئی - آزادی کے فوراً
بعد سرحد کے دونوں طرف جو خون خرابہ ہوا اس میں اس
جلد بازی کا بھی دخل ہے - خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند
کے متعلق کہا ہے

"برما کو ہندوستان سے علیحدہ کرنے میں
تین سال لگے تھے، بمبئی کو سندھ سے علیحدہ
کرنے میں دو سال اور اڑیسہ کی بہار سے
علیحدگی میں دو سال - اس کے برخلاف ایک
اتنے بڑے ملک یعنی ہندوستان کی تقسیم میں
صرف ڈھائی مہینے لگے" [1]

غرض ملک کی تقسیم کے ساتھ ملی ہوئی آزادی کے موقع پر جس
بربریت، بہیمیت اور وحشت کا ثبوت دیا گیا اس کی مثال دنیا
کی تاریخ میں شاید مشکل سے ہی ملے گی - ہندوستانیوں اور پاکستانیوں

---

[1] India Since Partition — Andrew Mellar P. 39

نے فساد کی صورت میں جس نفرت و رقابت اور غارت گری کا
مظاہرہ کیا وہ اس قدر روح فرسا اور مایوس کن تھا کہ انسانی قدروں
کی حقیقت پر شک ہونے لگا۔ انسانیت کا سر جھک گیا اور دنیا کے
سامنے گوتم بدھ، چشتی اور گرونانک کے پیغام محبت شرمسار ہوگئے
بقول ڈاکٹر محمد حسن

"یہ محض ایک سیاسی حادثہ نہیں تھا ایک
عمرانی انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ ہمارے
من کار اس کے تماشائی نہیں تھے اس طوفان
سے ہو کر گزرے تھے۔ لاکھوں انسان زمین
خاندان اور صدیوں کی روایات کا دامن چھوڑ
کر نقل مکان کر رہے تھے۔ فاقے، وبا اور
نقل وحمل کی دشواریوں نے انسانی قدروں کی
بنیاد ہلا ڈالی تھی ایک بار انسان حیوان کی طرح
خون چاٹ رہا تھا اور مخمور دیوانی آنکھوں سے عورتوں
اور بچوں پر نئی افتاد توڑنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔" [1]

---

[1] "ادبی تنقید۔ از ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۵۹

آزادی ملنے کے بعد سب سے اہم مسئلہ ان فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کا تھا۔ کسی طرح اس منافرت کی آگ پر قابو پا لیا گیا لیکن سماجی اور معاشرتی زندگی بحران سے دوچار ہو گئی۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی ہزاروں خاندانوں کی بھی تقسیم ہو گئی۔ مسلمانوں میں یہ مسئلہ خصوصاً بڑا اہم بن گیا۔ والدین ہندوستان میں رہ گئے تو بیٹے پاکستان کے ہو گئے بہنوں اور بھائیوں کے درمیان ہند و پاک کے سرحد کی لکیر ایک گہری کھائی بن گئی۔ اسی عالم وحشت میں بہت سی عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کیا گیا۔ منویہ لڑکیوں کی برآمدگی کے لیے دونوں ملکوں میں منظم طور پر کوشش بھی کی گئی لیکن اس دوران ان کے ساتھ کتنے ہی حادثے ہو چکے تھے۔ اگرچہ بربریت کے اس دور میں ان گنت واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جو رواداری، شرافت اور اخلاقی قدروں کو سربلند کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ان سانحوں کے سامنے کچھ بھی نہیں جو ہندوستان اور پاکستان کی سرزمین پر ہوئے۔

تقسیم کا معاشرت پر بھی براہ راست اثر پڑا۔ جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان گئے ان کے لیے یہ بات

بڑی اہمیت کی حامل تھی کہ ان کی معاشرت ہندوستان ہی میں چھوٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ ایک نئے ملک میں پہنچ رہے تھے ان کی اپنی بول چال کی زبان بھی مقامی لوگوں سے مختلف تھی۔ رہن سہن کے طریقے بھی جداگانہ تھے اور پھر وہاں کی مقامی آبادی بھی ان کے پہنچنے سے اپنی معاشرت اور معیشت کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگی۔ کم و بیش یہی حال ہندوستان میں بھی تھا۔ یہی خدشات یہاں بھی تھے اور ان ہی مسائل سے یہاں کے عوام بھی دوچار تھے۔ ہندوستان سے پاکستان جانے والوں کو اس بات کا دکھ تھا کہ نئے ملک میں ان کی انفرادیت ختم ہوگئی اور ان کے اجداد کا ورثہ ان کی شناخت ہندوستان میں چھوٹ گئی تو ہندوستان میں رہنے والے بوڑھوں کو اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہ نئے نئے لوگوں کے رہن سہن کے طور طریقوں کا اثر ان کی معاشرت پر بھی پڑ رہا ہے جسے وہ آسانی سے قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں ہی ملکوں میں نقل مکانی سے اخلاقی، معاشرتی اور سماجی قدروں میں تصادم ہونا لازمی تھا۔ اس کے سبب قومی یکجہتی کا مسئلہ الگ کھڑا ہوا اور دونوں ملکوں میں لسانی مسائل

پیدا ہو گئے اور اس مسئلے سے سب سے زیادہ اردو زبان متاثر ہوئی ۔ اردو جو کل تک سرکاری دفاتر کی زبان تھی اب وہ گھر کی چہار دیواری میں قید کر دی گئی ۔ غرض کہ آزادی کے بعد ملک کی تقسیم نے بہت سے سماجی، معاشرتی و جذباتی مسائل کو جنم دیا اور ان مسائل نے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا ۔

ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ بحران نے ملک کی معیشت کو بھی درہم برہم کر دیا۔ لاکھوں لوگوں کے گھر بار اجڑ گئے ۔ کئی گھروں کے چراغ بجھ گئے ۔ ہزاروں خاندانوں کا بیوپار ختم ہو گیا کیتی باڑی کی زمین چھین لی گئی اور آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے ۔ بہتیرے لوگوں کا تو سب کچھ لوٹ گیا اور تن پر محض بوسیدہ کپڑے رہ گئے ۔ دوسروں کو کھلانے والے خود پناہ گزیں کیمپوں کی خوراک کے محتاج ہو گئے ۔ ان کی باز آبادکاری کا مسئلہ دونوں ملکوں کے لیئے سیاسی سے زیادہ سماجی اور معاشی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ؎ بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

ملک کی کمزور معیشت پر یہ ایک بہت بڑا بوجھ تھا ایسی صورت میں ہر تاریک وطن کی بنیادی ضروریتں پوری کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

یہ صحیح ہے کہ دونوں حکومتوں نے ہر امکانی کوشش کی کہ ان لوگوں کو جب تک کہ وہ کیمپوں میں رہیں انھیں خوراک، علاج و معالجہ کی سہولتیں ملتی رہیں۔

ان حالات کا اثر یہ بھی ہوا کہ اشیائے ضروری کی قیمتوں میں دوسری جنگ عظیم سے جو اضافہ کا رجحان پیدا ہوا تھا اس میں شدت آگئی۔ چیزیں بازار سے غائب ہو گئیں اور چور بازاری و باد بن گئی۔

جب حکومت کو مہاجرین کی باز آبادکاری سے کچھ سکون ملا تو کانگریس پارٹی کو اپنے کیے ہوئے وعدے پورا کرنے کا موقع ملا۔ کروڑوں غریب کسانوں کو راحت دینے کے لیے زمینداری کا خاتمہ ضروری تھا چناں چہ اس مقصد کے لیے مختلف ریاستوں نے قانون بنانے شروع کیے۔ خاتمہ زمینداری تقریباً ۸۳ فیصد آبادی کے لیے پیغام مسرت تھی یہ لوگ زمینداروں کی اراضی پر اپنا خون پسینہ بہا کر اور دن رات ایک کر کے اس میں جو کاشت کرتے وہ انھیں دو وقت کی روٹی بھی فراہم نہ کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کی آمدنی پر زمیندار کا حق ہوتا تھا۔

خاتمہ زمینداری قانون پاس ہونے سے یہ کاشت کار زمین کے
مالک قرار دیئے گئے لیکن دوسری جانب چھوٹے چھوٹے یا متوسط
طبقہ کے زمینداروں کے لیئے اس سے ان گنت مسائل پیدا ہو گئے۔
ہزاروں گھروں کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ ان گنت خاندان جو
سکون و اطمینان اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے تھے کسمپرسی
کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

ملک کے سیاسی مسائل بھی وہ نہ رہے جو دور غلامی
میں تھے۔ یعنی غیر ملکی حکومت کے جبر و استبداد کا زمانہ ختم ہوا
لیکن اس کے ساتھ ہی نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کی
تقسیم کا سب سے زیادہ اثر پنجاب اور بنگال پر پڑا جن کے دو حصے
کر دیئے گئے ایک حصہ ہندوستان میں رہ گیا تو دوسرا پاکستان کا
ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسے بسائے گھر اتوں رات اجڑ گئے
ہندو اور مسلمان جو ایک دوسرے کے غم گسار تھے وہ تقسیم کا
اعلان ہوتے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جس
کی وجہ ان کی وہ نفسیاتی کشمکش تھی جو رجعت پسند سیاسی جماعتوں
کی پیدا کردہ تھی۔ مسلم لیگ پاکستان میں غیر مسلموں کو دیکھنے کی

روادار نہیں تھی اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا ہندوستان کو صرف ہندو راشٹر بنانا چاہتے تھے۔

ہندوستان میں ریاستوں کے انضمام کے وقت کشمیر ریاست کے الحاق کا مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ جلد ہی ہندو پاک کے درمیان جنگ کا باعث بنا اور اس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان عدم اعتماد کی ایک گہری خلیج پیدا ہو گئی۔ عوام پر اس کا براہ راست اثر پڑا۔ سب سے زیادہ وہ خاندان متاثر ہوئے جن کے کچھ افراد ہندوستان میں رہ گئے تھے اور کچھ پاکستان چلے گئے تھے۔ اس جنگ میں بہت سے ایسے واقعات سامنے آئے جن میں فرض کے سامنے انسانی جذباتی رشتے ماند پڑ گئے یعنی ایک ہی خاندان کے دو افراد محاذ جنگ پر تھے ساتھ ساتھ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مقابل۔ ایک ہند کو سربلند کرنے کے لیے تو دوسرا پاکستان کی کامرانی کے لیے۔ اس طرح دونوں ملکوں کے مابین سیاسی مسائل نے انفرادی طور پر بہت سے خاندانوں کے افراد کو جو دو ملکوں میں تقسیم ہو کر جدا ہو گئے تھے ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ ان حالات نے متاثر خاندانوں کے لیے بہت سے جذباتی

اور نفسیاتی مسائل بھی پیدا کر دیئے۔

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک برطانیہ کی غلامی سے تو آزاد ہو گیا غلامی کی بیڑیاں بھی ٹوٹ گئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے گہرے زخم بھی دے گئیں جن سے آزادی کے حصول کی خوشیاں ایک المیہ کی صورت اختیار کر گئیں شاید سیاسی تاریخ میں یہ سب سے بڑا المیہ تھا کہ ملک کو آزادی ملی تو لوگ دل کھول کر خوشیاں بھی نہ منا سکے اور آنے والے چند برسوں تک فضا میں ہر طرف سسکیاں گونجتی رہیں۔

ادب بھی ان سارے حالات سے متاثر ہوا۔ اردو کے ادیب اور شاعر بھی ملک و قوم پر جو کچھ گزرتی رہی اس سے ہمیشہ وابستہ رہے اور اسے اپنے فن میں سموتے رہے۔ انھوں نے ملک میں سماجی اصلاح پسندی کے رجحانات کی عکاسی بھی کی اور انھیں فروغ بھی دیا۔ جب سماجی زندگی میں انقلاب کی آوازیں بلند ہوئیں تو اقبال، پریم چند اور مولانا ابو الکلام آزاد کی رہنمائی میں اس آواز پر لبیک بھی کہا گیا۔ سماجی روایات کے دم گھونٹنے والے بندھنوں سے آزادی حاصل کرنے کے رجحانات سے متاثر ہو کر ترقی پسند تحریک

کی بنیاد ڈالی گئی۔ غرض ہندوستان کی سیاسی و سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں ادب ان کی عکاسی کرتا رہا۔

۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا خیال ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک سرشاری کی کیفیت رکھتا تھا۔ اس آزادی کو وہ صرف ہندوستانیوں کے لیے ہی پیغام مسرت نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریخ عالم کے لیے بھی ایک نئے باب کے مترادف قرار دیتے تھے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ آزادی کے بعد معاشرے کا انتظامی ڈھانچہ بدلے گا اس کے سیاسی، سماجی، تعلیمی و تہذیبی رویوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ عہد غلامی میں عدل و انصاف، جبر و اختیار، سرمایہ و دولت کی تقسیم کے جو معیارات تھے ان پر نظر ثانی کی جائے گی اور انہیں ملکی فرورتوں کے مطابق بنایا جائے گا۔ آزادی کی برکتیں کسی خاص طبقہ یا گروہ کے لیے مخصوص نہ ہوں گی بلکہ تھوڑی بہت سب کے حصہ میں آئیں گی۔ معاش کے وسائل اور تقسیم کا ایسا نظام قائم کیا جائے گا امیر و غریب کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے گا۔ اس طرح کی اور بہت سی توقعات آزادی کے سالقہ وابستہ تھیں لیکن آزادی جس صورت میں جلوہ گر ہوئی اس

کی وجہ سے ساری خوشیاں ماند پڑ گئیں اور انہیں یہ کہنا پڑا ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس دور میں شاعر اور ادیبوں نے کسی مخصوص مذہبی عقیدے کے بجائے اعلیٰ انسانی قدروں کی تلقین کی۔ ان کی بیشتر تخلیقات میں یہی مقصدیت حاوی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بدلتی ہوئی سماجی زندگی کا فرد کے ذہن و دماغ پر ردعمل دکھانے کی بھی کوشش کی۔ ناول ہو یا افسانہ۔ غزل ہو یا نظم۔ طنز ہو یا مزاحیہ مضمون یا ریپورتاژ۔ ان سب میں انسان دوستی اور عصری زندگی سے ان کا گہرا رشتہ نمایاں ہے۔

دور جدید کے آغاز میں مثالی یا آئیڈیل انسان کا تصور پیش کرنے کی طرف توجہ کی گئی تھی پھر مخصوص سیاسی حالات میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں سیاسی انسان کا تصور حاوی رہا۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے دور میں ادیب کے ہاں آئیڈیل یا مثالی انسان کی تلاش نظر نہیں آتی بلکہ ایک امن پسند انسان نظر آتا ہے۔ ادیب و شاعر کی یہ امن پسندی اسی بیسویں صدی کے اواخر کی

امن پسندی نہیں ہے بلکہ اب اس کا سماجی شعور بیدار ہے اور وہ آزاد ہندوستان کا شہری ہے اس کے دل میں تعمیر نو کا جذبہ ہے۔ ماضی کے حسن پرستی کی روایت اگرچہ کہ اب بھی اس میں موجود ہے لیکن وہ اس میں بے خود ہونے کے بجائے کچھ اور پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ ادب چوں کہ بنیادی طور پر انفرادی عمل اور فرد کے ذہنی کشاکش کی پیداوار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے سماج سے یگانگت اور شعوری وابستگی اور عصری مسائل سے عملی دلچسپی ہی کسی ادیب میں خود اعتمادی حقیقت کا صالح ادراک اور وسعت نظر پیدا کرتی ہے جو اس کے فن کو تفسیر اور تنقید بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ اردو ادیبوں کا غم و غصہ، طنزیہ انداز خطابت سماج سے اسی شعوری وابستگی اور عصری مسائل میں ان کی عملی دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ اس دور کے ادب میں عوام کے زندہ جذبات اور تجربات کی جلوہ گری ہے۔ ان میں اس دور کے درد و داغ بھی ہیں اسی کے ساتھ انسانیت اور بہتر مستقبل کی امید اور یقین کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس دور میں فنی اعتبار سے بھی کچھ نئے تجربے کیے گئے۔ آزاد نظم کو فروغ دے کر اسے سماجی شعور کے اظہار کا وسیلہ بنایا گیا۔

نثری نظم کا فروغ بھی اسی دور میں ہوا۔ نثر میں پیروڈی
نگاری کی کوشش بھی اسی دور میں کی گئی اور رپورتاژ کو فروغ
دے کر اسے اردو کی ایک نمایاں نثری صنف بنانے کی کوشش کی گئی۔
اس دور کے افسانوی تخلیقات میں شعوری طور پر سماج سے قریب
رہنے اور حقیقت آفرینی پر زور دیا گیا۔ عام امن پسند انسان جو اس
دور کے ادب میں نظر آتا ہے کبھی کبھی تشکیک کا شکار بھی معلوم
ہوتا ہے چوں کہ اس دور میں سارے عقیدے اور ساری قدریں
مٹتی ہوئی نظر آتی تھیں اس لیے ادیبوں اور شاعروں پر بھی اس کا
اثر لازمی تھا۔ چناں چہ اگر اردو کی نثری تخلیقات کا جائزہ لیا
جائے تو محسوس ہوگا کہ ہر میدان میں تقسیم ہند اور اس کے نتیجہ
میں رونما ہونے والے فسادات موضوع بحث رہے ہیں۔ ناول
پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو افسانے میں
موجود تقسیم ہند کے اثرات کا سرسری جائزہ لیا جائے۔

فسادات کے زیر اثر تخلیق کیے گئے ادب میں ہمیں
سب سے پہلے کرشن چندر کی متعدد کہانیاں ملتی ہیں جو "ہم وحشی ہیں"
نام کے مجموعے کی صورت میں شائع ہوئیں۔ ان کہانیوں نے ذہنوں کو

متوازن کرنے میں انقلابی فضا قائم کی۔ اس کے علاوہ عصمت چغتائی کی "جڑیں" بیدی کا "لاجونتی" حیات اللہ انصاری کے "ماں بیٹا" اور "شکر گزار آنکھیں" خواجہ احمد عباس کے "اور میجر رفیق مارا گیا" "دوسری موت" اور "سردار جی" اہم افسانے ہیں۔ ابراہیم جلیس اور شاہد احمد دہلوی کے ریورتاژ "دو ملک ایک کہانی" اور "دلّی کی بپتا" اور فکر تونسوی کا ریورتاژ "چھٹا دریا" اسی ہنگامی کیفیت کا نتیجہ فکر ہیں۔

ہند و پاک دونوں میں فسادات سے عملی و ذہنی اعتبار سے متاثر ہونے والے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں۔ اشفاق احمد، شوکت صدیقی، انتظار حسین، فکر تونسوی، جوگندر پال، رام لعل فسادات سے راست متاثر ہوئے۔ اشفاق احمد کا "گڈریا" شوکت صدیقی کا "پلتے ہیں میر خوار" اور "سمجھوتہ" فکر تونسوی جوشیاری طور پر طنز نگار ہیں کا "سالوتان شاستر" جوگندر پال کا "کچھوے" اور رام لعل کا "ایک شہری پاکستان کا" ایسے افسانے ہیں جو ملک کی تقسیم تاریخی جزو ہونے کے علاوہ ایک نئی فکر کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانے "گڈریا" میں ایک ہندو

استاد جس نے پاکستان کے ایک قصبے میں مسلم لڑکوں کو اردو اور فارسی کی تعلیم دی تھی، کو اچانک اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑتا ہے تو مسلم طلباء حالات کی اس ستم ظریفی کو پہلی مرتبہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ شوکت صدیقی کا افسانہ "لیرتے ہیں میر خوار" میں ہندوستان کا ایک قابل قدر موسیقار کراچی جاکر ویسی ہی سرپرستی حاصل نہیں کر پاتا جو غیر منقسم ہندوستان میں اسے راجاؤں، مہاراجاؤں کی وجہ سے حاصل تھی اور وہاں ایک طویل اور تکلیف دہ جدوجہد کے بعد بالآخر جوتیاں گانٹھ کر پیٹ بھرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دام لعل کا افسانہ "ایک شہری پاکستان کا" ایک ایسے سوال پر ختم ہوتا ہے جو تقسیم اور فسادات کی وجہ سے کئی شادی شدہ جوڑوں کو الگ کر دیتا ہے اور ایک مدت کے بعد دوبارہ مل جانے پر بھی ان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور وہ سوال اپنی جگہ جوں کا توں موجود رہتا ہے۔ ہمارے ادیب کسی خاص عرصہ تک ایسی کہانیاں لکھ کر اپنے کرب سے نجات نہیں پا سکے کیوں کہ آبادکاری، جڑوں کی تلاش، بے وطنی اور اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی ناوابستگی کے شدید احساس کے جلد مسائل ہمیشہ

ان کا پیچھا کرتے رہے ۔ ہمارے عہد کے ایسے شدید کرب کی مثال جوگندر پال کے "کچھوے" میں ملتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "لاجونتی" بھی تقسیم سے کم و بیش آٹھ نو برس کے بعد کی تحریر ہے اور رام لعل کی کہانیاں "نصیب جلی" "نئی دھرتی پرانے گیت" اور "اکھڑے ہوئے لوگ" بھی دس پندرہ سال کے عرصہ کے بعد ہی لکھی گئیں ۔ یعنی تقسیم ہند کے اثرات وقتی یا ہنگامی ہونے کے بجائے دیرپا ثابت ہوئے اور ممکن ہے کہ ان کی نشاندہی آئندہ صدی تک بھی کی جاتی رہے۔ حالاں کہ تقسیم کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں دو جنگیں لڑی گئیں ۔ ان میں اگرچہ فسادات سے کہیں زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا لیکن یہ دونوں جنگیں اتنا بڑا ادب تخلیق کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں جتنا اثر فسادات کی وجہ سے پڑا۔

الغرض تقسیم کے بعد افسانوی ادب سے جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آزادی کے بعد فسادات نے ہمیں ایک غالب رجحان دیا ہے کیوں کہ اس کے بعد ہم اپنے معاشرے میں طبقاتی یا فرقہ وارانہ توڑ پھوڑ کو کبھی برداشت نہیں کر سکے یہی رجحان ہمارے ملک کے سیکولر مزاج سے پوری ہم آہنگی اور مطابقت رکھتا ہے۔

# چوتھا باب

# اُردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات

ادب کی تمام اصناف میں ناول ایک ایسی صنف ہے
جس میں ایک عہد اور ایک معاشرہ کی اجتماعی و خارجی زندگی کے
حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے ۔ یوں تو فنون لطیفہ کا ہر شعبہ
اپنے ماحول اور سماجی عوامل سے بے نیاز نہیں رہتا لیکن شاعری یا
دوسری اصناف خارجی اور داخلی حقائق کے ردعمل اور تاثر کو پیش
کرتی ہیں لیکن ناول ان حقائق کے جزئیات کا مشاہدہ بھی پیش کرتا
ہے اور ان تمام نقوش کو ابھارنے کی بھی کوشش کرتا ہے جن سے
ہم ان اسباب و علل کا تجزیہ کر سکیں اور ان قدروں کے باہمی پیکار
کو سمجھ سکیں جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی ہمیں رنگا رنگ جلوے
دکھاتی ہے ۔

اردو ناول بھی آزادی کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے
حالات کی غمازی کرتا نظر آتا ہے ۔ اس دور کے ناولوں میں جہاں
ایک طرف ہندوستانی زندگی کے پیچ در پیچ حقیقتیں ہیں بدلتی ہوئی
سیاسی و معاشرتی زندگی ہے وہیں دوسری طرف انسان کی ذہنی کشمکش
کے متضاد پہلو کے عکس بھی نمایاں ہیں ساتھ ہی سماج کو بدلنے کی شدید

خواہش کا اظہار بھی ہے۔

تقسیم کے بعد فسادات کی صورت میں جو کچھ کیا گیا

نفرت و رقابت، قتل و خون، غارت گری اور انسانیت سوز

مظاہرے ہوئے وہ اس قدر روح فرسا اور مایوس کن رہے کہ

تمام انسانی قدریں ہیچ نظر آتی ہیں۔ زندگی کا یہ تضاد بے بسی و بے چارگی

کا یہ احساس اس دور کے ناولوں میں اپنی پوری آب و تاب کے

ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ سیاسی، سماجی، معاشی و تہذیبی

تبدیلیاں ہر ادیب و فن کار کو متاثر کرتی ہیں لیکن نتائج کے اعتبار

سے ان کے نقوش کہیں واضح اور کہیں دھندلے نظر آتے ہیں۔ مثال

کے طور پر وہ ادیب و فن کار جن کا سیاسی و سماجی شعور پختہ تھا

اور نظریاتی سطح پر ان واقعات کو بین الاقوامی سازش، رجعت

پسند عناصر اور سرمایہ دار ذہنیتوں کی کرشمہ سازی سے زیادہ

اہمیت نہیں دیتے تھے ہجرت اور عدم ہجرت ہر دو صورت میں

جذباتی ہیجان اور غیر انسانی تعصب و تنگ نظری سے بالاتر

ہو کر سماجی استحکام کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ان

کے یہاں ماضی کی گونج بھی نظر آتی ہے لیکن وہ ماضی کی صرف زندہ

روایت سے ہی اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ لیکن وہ ادیب و فن کار جو معاشرتی زندگی کے انتشار اور مادی رشتوں کی شکست و ریخت کے باعث اپنے ہی وطن میں مہاجر بن گئے تھے سکون و آسودگی کی تلاش انھیں کبھی کبھی ماضی کی طرف لے جاتی ہے اور وہ ان پرانے رشتوں اور معاشروں کو یاد کرنے لگتے ہیں جن میں انھیں مرکزیت حاصل تھی لیکن انھیں خاتمہ زمینداری، سیاسی و معاشی بحران، تحفظ و بقاء کی خواہش اور مقابلہ کی دوڑ وغیرہ مسائل کا اس طرح سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ماضی بھی دیر پا سکون کا باعث نہیں بن سکتا اور بے چینی و اضطراب انھیں ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں جہاں ماضی حال سے اور حال ماضی سے بدتر نظر آنے لگتا ہے۔ جذباتی وفاداریاں اگر اپنی طرف بلاتی ہیں تو عصری تقاضے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

ان حالات سے ادیبوں کا وہ طبقہ زیادہ متاثر نظر آتا ہے جو متوسط اور تعلیم یافتہ ہے جو آزادی سے قبل اپنے آبائی وطن میں نہایت اطمینان، فراغت اور خوش حالی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بھی کچھ خواب تھے جو ماضی میں جد و جہد کے مختلف

مراحل سے گزر کر اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ روشن مستقبل کا
تیقن اور سمت و رفتار کا تعین آسان نظر آنے لگا تھا لیکن تقسیم نے
اس کو تو ڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ وہ تو صرف خواب دیکھتا رہا اور حقیقتوں
نے اسے چور چور کر ڈالا۔ اس نے سماج کی جن توہمات اور تعصبات کو
اپنے خیال و خواب کی دنیا میں کچل ڈالا تھا وہ اس شدت سے ابھرے
کہ ان کی بنیاد پر ملک، تہذیب، خاندان، گھر بار حتیٰ کہ انسان کا
وجود بھی تقسیم ہو گیا۔ فرد کے اعتقادات اور اقدار خارجی زندگی
کی حقیقتوں سے اس طرح ٹکرائے کہ شیشے کے ٹکڑوں کی طرح
بکھر گئے۔ تقسیم کا یہ کرب ایسا تھا جو ایک عرصہ تک اردو ناول پر
حاوی رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد فسادات پر جو ناول لکھے گئے ان میں
رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا" ایم اسلم کا ناول "رقص
ابلیس" رشید اختر کا "پندرہ اگست" نسیم حجازی کا "خاک اور
خون" قیس رامپوری کے "خون بے آبرو" اور "فردوسی" اور
رئیس احمد جعفری کا "مجاہد" ہیں۔ ان تمام ناولوں میں رامانند
ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا" قابل ذکر ہے۔

رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مرگیا" کی بنیاد

فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ یہ ناول ان فسادات میں مبتلا ہوکر اور

ان سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ اس میں فرقہ وارانہ فساد ہی سے متعلق

واقعے اور حادثے اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔ خود ناول نگار نے دیباچہ

میں اس کی وضاحت کی ہے کہ فسادات کے دوران جو نوٹس تیار

کیے گئے انھیں پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی۔ انھوں نے یہ نوٹس

ان ہی ہنگامی حالات میں اکٹھا کیے۔ ان کی حیثیت روداد سفر

کی سی ہے جو روداد حیات بن گئی۔ وہ اپنے ناول کے لیے مختلف

حالات میں نوٹس تو لیتے رہے لیکن جذباتی سکون انھیں فراہم نہ

ہو سکا۔ لکھتے ہیں

"مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ میرے نوٹس
بھی مکمل نہ ہو سکیں گے اتنا کچھ ہو رہا تھا اور
کتنا کچھ ہونے کو باقی تھا۔ حتیٰ کہ ۱۵ اگست
کے بعد وہ قیامت بھی برپا ہوگئی جب ماں کو
بیٹے کی خبر نہ رہی، خاوند کو بیوی کی سدھ نہ رہی
لوگ آوارہ آندھیوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے

ایک دوسرے کو پکار رہے تھے لیکن کوئی

کسی کو اپنی خبر تک نہ پہنچا سکتا تھا.....

اسی دوران میں ۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو

میں نے یہ ناول "فساد اور امن" کے نام

سے لکھنا شروع کر دیا تھا..... پہلے

حصے لکھتا جا رہا تھا اور ایک انجانے اختتام

کے لیئے نوٹس بھی لیتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ

میں یہ جان گیا تھا کہ حالات اس رفتار

سے تبدیل ہو رہے ہیں ابھی سے اس کا کوئی

پورا پلان تیار کر لینا سخت حماقت ہوگی"۔ [1]

ناول تقسیم ہند کے وقت لاہور کے فرقہ وارانہ فسادات سے

شروع ہوتا ہے۔ اس کے مرکزی کردار آنند اور اوشا ہیں۔ اوشا

سیٹھ کشوری لال کی لڑکی ہے۔ آنند کشوری لال کی بیٹی اوشا سے عشق

کرتا ہے۔ آنند کے ذریعہ لاہور میں رونما ہونے والے حادثات کا

بیان کیا گیا ہے۔ آنند انسانی قدروں کا پرستار ہے۔ حالانکہ ملک

---

[1] "اور انسان مر گیا" از رامانند ساگر ص ۴۵-۴۶

میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک رہے ہیں وہ خود بھی اس
آگ میں جل رہا ہے لیکن اپنے ہم عمر نوجوانوں کی طرح اس کا توازن
نہیں بگڑتا بلکہ وہ انسانوں کی حفاظت کا شیوہ اختیار کرتا ہے خواہ یہ
انسان ہندو ہوں یا مسلمان ۔ ظالم اس کے خیال میں ہندو یا
مسلمان نہیں بلکہ صرف ظالم ہیں ان کا کوئی مذہب نہیں ۔ اور اگر
ہے تو ظلم ہی ان کا مذہب اور پیشہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب
آنند کے ساتھیوں نے شمس دین کے گھر کو جلا ڈالا تو یہ دیکھ کر
آنند مضطرب ہو جاتا ہے ۔

"آنند نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ بھاگتا ہوا اپنی
گلی میں پہنچ گیا وہاں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ
واقعی شمس دین کے مکان کو آگ لگی ہوئی
تھی اور کوئی نوجوان آگ بجھانے والا موجود
نہ تھا ۔ صرف ایک طرف دو چار بوڑھے اس
آگ کو دیکھ دیکھ کر کچھ اس طرح ہاتھ مل رہے تھے
جیسے یہ شمس دین کا مکان نہیں بلکہ خود ان کے
بچپن کو زندہ جلایا جا رہا تھا ۔ اسے دیکھتے ہی

انھوں نے فریاد کے انداز میں پکارا

آننہ — اس آگ کو بجھاؤ دیکھو یہاں

کوئی نہیں ہے۔ لیکن آننہ بجھاتا کیسے —

پانی کے جو ذرم اس قسم کے کسی حادثے

کے لیئے بھرے رہتے تھے کسی نے بالکل خالی

کر دیئے تھے اور تلاش بسیار کے باوجود

اسے کہیں سے بھی ایک بالٹی نہ ملی کہ وہ

کنوئیں سے پانی نکال لیتا۔ اسے اور کچھ

نہ سوجھا تو وہ پریشانی کے عالم میں

خفیہ سامان والی پناہ گاہ میں گھس گیا

..... باہر آگ بہت بھڑک گئی تھی

آننہ نے لمحہ بھر کے لیئے کھڑکیوں کے

قریب رقص کرتے ہوئے شعلوں کو

دیکھا اور پھر وہ سیدھا اس مکان

میں گھس گیا۔ شعلے ہر چہار طرف سے

اس کے گرد لپٹنے کی کوشش میں آگے

بڑھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "[1]

آخرکار آنند کی زندگی کو بچانے کے لیئے دوسرے نوجوانوں نے آگ بجھانے کی خاطر پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں اٹھالیں۔ اس طرح آنند آگ بجھانے میں کامیاب ہوگیا۔

لاہور میں فسادات اس وقت قابو سے باہر ہوگئے جب اسٹیشن پر نیم مردہ جسموں اور لاشوں سے بھری ٹرین آکر رکی۔ ٹرین دیکھتے ہی لوگ پاگل ہوگئے اور ہندوؤں کے قتل عام اور ان کے گھروں کو جلانے کا سلسلہ شدت اختیار کرگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا شہر شعلے اور دھوئیں میں تبدیل ہوگیا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ آنند کا گھر بھی جلا دیا گیا۔ زندہ بچے ہوئے لوگوں کو کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ کیمپ میں آنند کی ملاقات سیٹھ کشوری لال سے ہوئی۔ کشوری لال اپنی رقم بچانے کی فکر میں بیوی اور بیٹی اوشا کو چھوڑ کر خود بھاگ آئے تھے۔ بقول خواجہ احمد عباس

"اس سے بھی خوفناک واقعات آپ نے
پہلے بھی سنے ہیں اور پڑھے ہیں لیکن ایسا اثر

---

[1] "اور انسان مر گیا" از رامانند ساگر ص ۱۳۵-۱۳۷

آپ پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یہ فن کار کا
نہ صرف ادبی کمال ہے بلکہ خلوص اور انسان
دوستی کا نتیجہ ہے یہ ہنگامی سٹریچر نہیں
ایک کلاسیک ہے۔ اس کے قلم سے نکلے
ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی
صدائے بازگشت ہیں وہ اس ناول
کے ذریعہ، اس کے کرداروں کے ذریعہ
آپ کو آئینہ دکھا رہا ہے کہ اس میں
آپ انسان کے یعنی اپنے مسخ شدہ
خدوخال دیکھ لیں خوب پہچان لیں
کہ انسانیت کے مرنے کے بعد انسانیت
کی شکل کیا ہو جاتی ہے"۔ [1]

آنند اوشا کو تلاش کرنے کے لیے کستوری لال کے گھر گیا اسے
باہر سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ باہر ایک بزرگ مولانا
رو رہے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا مرنے والوں پر

---

[1] "اور انسان مر گیا" رامانند ساگر ص ۲۶

نہیں بلکہ مارنے والوں پر رو رہے تھے جنھوں نے اسلام کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ آنند کو مولانا مسجد لے گئے اور اسے شلوار قمیض پہنا کر اس مقام پر لے گئے جہاں او شادو لڑکیوں کے ساتھ قید تھی۔ مولانا نے تینوں لڑکیوں کو آنند کے حوالے کیا اور کہا کہ وہ انھیں کیمپ تک پہنچا دے۔ چلتے وقت مولانا نے ایک تھیلی بھی پیش کی یہ وہ مورتی تھی جسے جلتی ہوئی مندر سے مولانا بچا لائے تھے۔

جب کیمپ والے مشرقی پنجاب کی طرف روانہ ہوئے آنند اکیلا گھومتا ہوا ایک گردوارے کے پاس پہنچا جہاں سردار جی اس کا قتل کرنے ہی والے تھے کہ اس کے ہاتھ پر اوم لکھا دیکھ کر کرپان ہٹالی۔ سردار جی دو مسلمانوں کو مار چکے تھے۔ آنند زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکا اور ندی کی طرف چل دیا وہاں اپنے کو ایک کیمپ میں پایا۔ یہ سرکاری کیمپ نہ تھا بلکہ چند بھٹکے ہوئے لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کوئی کسی کا کچھ نہ تھا لیکن ایک دوسرے کے غم کا شریک تھا۔ سب کی کہانی ایک ہی تھی جو انسان کے ہی ستائے ہوئے تھے۔ مولانا پھر ایک لڑکی کو لیئے محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر آ گئے۔ کیمپ والوں نے مسلمان کو دیکھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ آنند

اور کشن چند نے انھیں بچا لیا اور اپنے خیمہ میں لے آئے ۔ مولانا ہندو پاک کے دردناک واقعات سنانے لگے ۔ مذہب کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ

"صرف نماز ہی کا نام مذہب نہیں ہے اور نہ انسان کو محض خدا کی حمد گاتے رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کام کے لیئے ملائکہ اور فرشتے بہت تھے ۔ انسان کو انسانیت کی خدمت کرنے اور خدا کی اس کائنات کو خوبصورتی اور پیار سے بھرنے کے لیئے بھیجا گیا ہے اور یہی اس کا حقیقی مذہب ہے" [1]

بالآخر یہ لوگ ہندوستان جانے والے قافلے میں شامل ہو گئے ۔ اچانک قافلے پر حملہ ہوا لیکن کسی میں مقابلے کی ہمت نہیں تھی ۔ کشن چند نے آگے بڑھ کر حملہ آور کی بندوق پکڑ لی لیکن جب تک گولی لگ چکی تھی فائر کشن یعنی رحمان کے بھائی اسمٰعیل نے کیا تھا ۔ رحمان کہتا رہا میں تمہارا بھائی ہوں لیکن اسمٰعیل اسے کافر

---

[1] "اور انسان مر گیا" راما نند ساگر ص ۸۷

کہتا رہا۔ یہ قافلہ راوی ندی کا لفف پل پار کر چکا تھا کہ مولانا نے آواز دی۔ مولانا کی گود میں بچہ تھا جسے آنند نے راستے میں چھوڑ دیا تھا۔ مولانا نے آنند سے کہا یہ آنے والے کل کا انسان ہے۔ آنند پاگل ہو چکا تھا یہ کہتے کہتے کہ میں انسان کو مار ڈالوں گا اس نے مولانا کی گردن دبوچ لی۔

ناول میں ہر حادثے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم کے المیہ نے انسانیت کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ناول ہمیں سوچنے اور نفرت کے خلاف عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ بقول خواجہ احمد عباس

"یہ ناول اعتراف شکست نہیں اعلان جنگ ہے ان منحوس شیطانی قوتوں کے خلاف جنھوں نے انسان کا خون کیا۔" [1]

غرض کہ رامانند ساگر نے یہ ناول خلوص، دردمندی اور مشاہدے کی قوت کے ساتھ لکھا۔ جذبات نگاری اس ناول کی نمایاں صفت ہے جو عام طور پر لپو دے فسادات ادب میں پائی جاتی ہے۔

---

[1] "اور انسان مر گیا" رامانند ساگر ص ۲۷

اس بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا نظریہ ہے کہ

"سا گر کے ناول یا فرقہ وارانہ فسادات کے
مسئلے پر لکھے ہوئے کسی ناول کی کامیابی کا
دار و مدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس میں
ہنگامی صورت حال کی دردمندانہ عکاسی
کی گئی ہے یا فرقہ وارانہ فسادات کے المیے کی
تصویر کشی ہے بلکہ اس کی کامیابی اس میں
ہے کہ انسانی شخصیت کا سارا زہر ان ناولوں
میں سامنے آیا۔ انھوں نے ایک غیر معمولی
صورت حال سے انسان کی اندرونی شخصیت
کی نئی سطح پر مطابقت یا مخالفت کرنے
کی صلاحیت کو ظاہر کیا۔ ان ناولوں کی
کشمکش انسان کے تہذیبی مزعومات،
اقدار و اعتقادات اور زندگی کی سنگین
حقیقتوں کے درمیان ٹکراؤ کی کشمکش
سے پیدا ہوئی تھی۔ گہرائی سے دیکھا جائے

131

تو یہ پوری صورت حال جو اس
قسم کے ناولوں کے لیے عقبی زمین
کا کام دے رہی تھی دراصل ہندوستان
کے ذہن اور دل، ضمیر اور اندرونی
شخصیت، مزعومات اور عمل کی
کشمکش تھی۔" [1]

---

[1] "جدید اردو ادب" محمد حسن ص ۱۵۱

# خاک اور خون

نسیم حجازی

نسیم حجازی کے اس ناول میں جہاں مشرقی پنجاب
کے فسادات کی ہولناکیوں کا اظہار ہوتا ہے وہیں اس وقت کے
سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان
سیاسی حالات کا تفصیل سے بیان کیا ہے جو ان خونیں فسادات کا سبب
بنے۔

"خاک اور خون" چار حصوں پر مشتمل ہے۔
مکراہٹیں، دھرکنیں، سرخ لکیر (نیا دریا) اور اے قوم۔
ناول کا مختصر خلاصہ یہ ہے۔ ناول کا ہیرو سلیم مشرقی پنجاب کے
ایک گاؤں کے چودھری رحمت علی کا پوتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے
دلیر اور ذہین ہے۔ اس کے بچپن کے ساتھیوں میں مجید (سلیم
کا چچازاد بھائی) داؤد، ارشد، مہندر اور ملاب سنگھ ہیں۔
میٹرک کا امتحان دینے کے بعد سلیم نے چند نظمیں اور کہانیاں لکھیں
لیکن کالج کے ساتھی اختر نے اسے قوم کی فلاح و اصلاح کے لیے لکھنے
کی ترغیب دلائی اختر کی بدولت سلیم کے دل میں اپنی قوم کو بیدار
کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے کالج کے مختلف جلسوں میں ملکانوں

کو متحد کرنے کے لیئے، ان میں جذبہ حریت پیدا کرنے کے لیئے تقاریر
کیں اور اس میدان کا مرد مجاہد بن گیا۔

ملک کی آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی ضلع گرداسپور
کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ سلیم کے گھر کے تمام افراد شہادت کی
آگ میں زندہ جل گئے سلیم اور مجید ہی زندہ بچے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب
کی خاک کو اپنی مٹھی میں لے کر گاؤں کے باقی لوگوں کے ساتھ پاکستان
کے لیئے چل پڑے۔ راستے میں انھیں بارہا نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا
اور ان کے قافلے کے ساتھ کئی اور قافلے بھی مل گئے ان سب کی رہنمائی
اور حفاظت سلیم اور اس کے ساتھی کر رہے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے
بعد سلیم کشمیر کے محاذ جنگ میں شریک ہو گیا اور کشمیر کے محاذ پر
ہی اس نے ایک کتاب "اے قوم" لکھی جس میں اس نے قوم کو مخاطب
کر کے پاکستان کے دفاع کے لیئے پاکستان کی تعمیر کے لیئے اپنے آپ کو
وقف کر دینے کا درس دیا۔

ناول میں تقسیم ہند کے اسباب پر تفصیل سے روشنی
ڈالی گئی ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے۔ ہندوستان میں ہندو سامراج
کے ذہن میں آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوق آزادی سے

محروم کرنا تھا۔ وہ سانپ اپنے بل سے سر نکالنے کے لیے بے تاب تھا
جس کے زہر نے صدیوں پیشتر اچھوت طبقہ کی رگوں سے زندگی کی
حرارت چھین لی تھی۔ صدیوں پیشتر ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی
حاصل کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلیدان دیا کرتا تھا اور دیوتاؤں نے
اسے اچھوتوں کی بستیاں جلانے اور ان کے جھونپڑوں کی راکھ پر
اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ صدیوں تک
بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد
اچھوت طبقہ کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ برہمن اور اونچی
ذات کے ہندوؤں کی تقدیس کے احترام میں اپنے تمام انسانی حقوق
سے دستبردار ہو چکا تھا۔ اب ہندوؤں کے سامنے دس کروڑ مسلمانوں
کا مسئلہ تھا اور یہ وہ قوم تھی جس نے صدیوں تک اس ملک پر
حکومت کی تھی۔ پانی پت کی رزم گاہیں ہندوؤں کو یہ احساس دلانے
کے لیے کافی تھیں کہ تلوار کی جنگ میں وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں
کر سکتا چناں چہ وہ پرانے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر ایک نئے
دیوتا کی مدد کا طلب گار ہوا۔ یہ نیا دیوتا انگریز تھا۔

انگریز ہندوستان میں اس وقت داخل ہوئے جب

مسلمانوں کی سلطنت کے ستون کھوکھلے ہو چکے تھے تاہم ان کی آخری
قوت مدافعت جو بنگال میں سراج الدولہ اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان
کی صورت میں ظاہر ہوئی انگریزوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی
تھی کہ اس قوم کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں موجود ہیں۔ چناں چہ
انگریزوں نے مسلمانوں کو پسپا کرنے کے لیے ہندوؤں کی طرف ہاتھ
بڑھایا۔ غدر کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریزوں کی نظر میں اور زیادہ
معتوب ہو گیا تھا چناں چہ وہ چکی کے دو پاٹوں یعنی انگریز اور ہندو
کے درمیان پسنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز
میں ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کے تصور سے ہندوؤں
کی وہ پرانی جبلت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا
چولا پہن کر نیچ ذات کو ہمیشہ کے لیے حقوق انسانیت سے محروم کر دیا
تھا۔ اس بات سے ہندو اچھی طرح واقف تھے کہ ایک مرکز کے تحت
جمہوری نظام حکومت میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو بھی
سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے درجہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے گا
چناں چہ ہندو ورن آشرم کی جگہ ہندی نیشنل ازم نے لے لی۔ یہ ہندی

نیشنل ازم آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر اجاگر ہوئی۔ اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منوجی کے وون آشرم سے مختلف نہ تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ منوجی کی تحریک نے برہمن کی تقدیس کا سہارا لیا تھا اور کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا چاہتی تھی۔

مسلمانوں کا مدافعانہ احساس کچلنے کے لیے گاندھی نے انھیں آزادی کا سراب دکھایا۔ تحفظات کا مطالبہ کرنے والوں کو تنگ نظر فرقہ پرست انگریز کے ایجنٹ اور وطن کی آزادی کے دشمن کہا گیا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس سراب کی حقیقت سے واقف تھے جو گاندھی کی آستین میں چھپے ہوئے خنجر کو اپنی شاہ رگ کے قریب آتا دیکھ رہے تھے اور ہندو مقاصد کی چٹان کو بتدریج پانی سے ابھرتا ہوا دیکھ کر قوم سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری ناؤ رام راج کی اس خطرناک چٹان کی طرف دھکیل رہا ہے جس کے ساتھ ٹکرا کر یہ پاش پاش ہو جائے گی اور تم احمقوں کی طرح موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لیکن یہ آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ گول میز کانفرنس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ

کانگریس جس انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ
نہیں کہ انگریزوں کی حکومت کے بعد مسلمان اپنا سیاسی مستقبل ہندو
اکثریت کو سونپ دیں۔

مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب حالات نے یہ
ثابت کر دیا کہ کانگریس جسے آزادی کہتی ہے وہ ہندو اکثریت کا
دوسرا نام ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے پہلی بار کانگریس کی حکومت
ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ وارد ھائی مہاتما گاندھی
میں بجا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آ چکا تھا۔ رام راج کی بقاء کے
لیے مسلمانوں کے تمدن کے علاوہ ان کی زبان بدلنے کی ضرورت
بھی محسوس کی گئی چناں چہ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی
جدوجہد زیادہ شد و مد کے ساتھ شروع ہو گئی۔ ہندوؤں نے
مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے یہاں تک گوارا کر لیا تھا
کہ اچھوت ان کے چند صدیوں کو برشٹ کر ڈالیں۔ کینہ اور
نفرت کے ان جذبات کو وہ دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکے جن کی
اساس پر ہندو نیشنلزم کی عمارت کھڑی کی گئی تھی چناں چہ
وسط ہند کے صوبوں میں لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع

ہوگئیں۔ جس شہر یا گاؤں میں ہندو مسلمانوں پر حملہ کرتے وہاں کانگریسی حکومت کی پولیس ثالث بن کر پہنچتی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیئے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جاتا۔ مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی جواہر لال نہرو کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک انگریز دوسری کانگریس"۔

رام راج کا یہ دور اگرچہ مختصر تھا تاہم سنجیدہ مسلمانوں کو احساس دلانے کے لیئے کافی تھا کہ اگر انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو اندلس کی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔

چناں چہ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلمانوں کے مدافعانہ شعور کی علی صورت پاکستان کی قرار داد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ کانگریس نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہندو سامراج کے دام فریب سے خطرہ محسوس کر کے پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں تو اس نے نام نہاد علمائے دین کے اس گمراہ ٹولے کو آگے کیا جو خدا پرستی سے توبہ کر کے وطن کا پجاری بن چکا تھا۔ یہ علماء ہندو سامراج کا جال بچھانے والوں کی سکھائی ہوئی بولیاں بول رہے تھے "مسلمانو آؤ۔ یہ تمہاری آزادی

کی منزل ہے۔ دیکھو ہم آزاد ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ ہمیں یہاں پھنسانے
کے لیئے کوئی جال بچھایا گیا ہے آنکھیں کھول کر دیکھو یہاں اناج بھی ہے اور
پانی بھی۔ پاکستان جو کہ ہے ہمیں وہاں یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔

سلیم کانگریس کے تمام سیاسی ہتھکنڈوں سے واقف تھا
کالج کے ایک جلسہ میں اس نے پاکستان کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کی
مخالفت کرنے والوں کا جواب اس طرح دیا۔

"پاکستان کو اس ملک میں ہم اپنا آخری
دفاعی مورچہ سمجھتے ہیں یہ ہندو فسطائیت
کو روکنے کے لیئے ہماری آخری دیوار ہے
ہم ہندو کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں ہم اس
کی آبادی کی نسبت سے ہندوستان کے تین
چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصہ پر اس
کی حکومت کا حق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندو
کو اپنی آزادی سے زیادہ ہمیں غلام بنانے کی
فکر ہے جب ہندو مسلمانوں کی ہمدردی کا لبادہ
اوڑھ کر پاکستان کی مخالفت کرتا ہے تو اس

کی مثال اس ڈاکو سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے
ہمسایہ سے یہ کہہ رہا ہو بھائی دیکھو تم اپنے گھر کے
گرد چار دیواری کیوں بنا رہے ہو؟ اس کا تو
مطلب یہ ہے کہ تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو ایسی غلط
فہمیوں سے بھائی چارے میں فرق آتا ہے اس
لیئے میں تمہیں یہ دیوار تعمیر کرنے کی اجازت
نہیں دوں گا۔ ہوشیار ڈاکو عام طور پر گھر کے
کسی بھیدی کو ملا لیتے ہیں یہ گھر کا بھیدی اگر
مالک سے کہتا ہے ارے یار! یہ کیا مصیبت
ہے کہ تم ساری رات لٹھ اٹھائے دروازے
پر پہرہ دیتے ہو جاؤ اطمینان سے سو جاؤ
ورنہ پڑوسی یہ خیال کریں گے کہ تم انہیں
چور سمجھتے ہو۔ حضرات! یہ کانگریسی
مسلمان ہمارے گھر کے بھیدی ہیں۔" [1]

سلیم لوگوں کو پاکستان کے بارے میں اس طرح سمجھاتا ہے۔

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۲۲۸

"بھی پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ جن علاقوں میں
مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت
ہونی چاہیئے۔" [1]

جب لارڈ ویول نے کانگریس کو عبوری دور کے لیئے تشکیل وزارت کی دعوت دی تو مسلم لیگ نے انگریزوں کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف احتجاج کرنے کے لیئے ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ کیا جس کے ساتھ ہی بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے ہندوؤں نے لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔ اس کے بعد کلکتہ میں ڈائریکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر اینٹوں، گولیوں، دستی بموں کی بارش کی گئی ان حالات میں وائسرائے نے آگ پر مزید تیل چھڑکنے کے لیئے مرکز میں کانگریس کی وزارت بنا دی۔

ابھی تک مسلم اکثریت کے کسی علاقے میں فساد نہیں ہوا تھا لیکن ہندوؤں نے کلکتہ میں جو آگ لگائی تھی اس کے چند شعلے تو اکھاڑی جا پہنچے۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور کلکتہ کے کچھ

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۲۶۶

پناہ گزین ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی لرزہ خیز داستانیں سنانے کے لیئے وہاں پہنچ چکے تھے چناں چہ فساد شروع ہو گیا۔ سلیم کے دوست ناصر کا خط بہار کے فسادات پر روشنی ڈالتا ہے۔

"میں یہ خط کلکتہ کے ایک ہسپتال سے لکھ رہا ہوں۔ بہار میں آگ اور خون کے طوفان سے گزرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ بیان نہیں کر سکتا اگر بیان کر بھی سکوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا تمہیں یہ کیسے یقین آئے گا کہ دو ہزار انسانوں کی ایک بستی جہاں ایک صبح زندگی کی مسکراہٹیں بیدار ہو رہی تھیں شام تک راکھ کا ایک انبار بن چکی تھی جہاں سورج کی ابتدائی کرنوں نے جیتے جاگتے ہنستے بولتے انسانوں کو دیکھا تھا وہاں آفتاب کی واپسی نگاہیں بے گور و کفن لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ سلیم!

یہ میرا گاؤں تھا اور یہ صوبہ بہار کی ان

سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھا جہاں
بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے
اہنسا اور شانتی کے علمبرداروں کو ان کے
اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ مردوں اور عورتوں
کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضاء
کاٹ کر ہماری مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے
گئے۔ بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ نوجوان
لڑکیوں کی عصمت و عفت کی دھجیاں
اڑائی گئیں اور باپ اور بھائیوں کو یہ لوگ
سنگین مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے
اپنی ذلت اور رسوائی کا تماشا دیکھیں۔

..... تم شاید ہمیں بزدلی اور بے غیرتی
کا طعنہ دو لیکن یقین کرو کہ یہ وہ طوفان
تھا جس کے لیئے ہم قطعاً تیار نہ تھے۔ کانگریسی
حکومت ہم پر بھیڑیے چھوڑنے سے پہلے ہمارے
ہاتھ پاؤں باندھ چکی تھی وہ پولیس جو ہمارے

گھروں کی تلاشیاں لے کر چھوٹے چاقو تک ضبط
کر چکی تھی ہندوؤں کو ہتھیاروں اور پستولوں
سے مسلح کر چکی تھی۔ حکومت ان کی تھی۔ قانون
ان کا تھا۔ پولیس ان کی تھی۔ اسلحہ اور بارود
ان کا تھا۔ ہم کب تک لڑتے اور کہاں تک
مقابلہ کرتے؟ وہ خالی ہاتھ جو مدافعت
کے لیے اٹھے کٹ کر رہ گئے وہ سینے جن میں
غیرت اور ایمان تھا گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔
میرے گاؤں کے پانچ سو نوجوانوں نے
لاٹھیوں کے ساتھ چار گھنٹے ان ہتھیاروں کا
مقابلہ کیا جو تعداد میں ان سے آٹھ دس گنا
زیادہ تھے۔ جن میں سے بعض بندوقوں اور
پستولوں اور باقی تلواروں اور نیزوں سے
مسلح تھے اور ہم نے انہیں بھگا دیا۔ وہ چند
گھنٹوں کے بعد دوبارہ آئے تو ان کی تعداد
دس ہزار تھی اور پولیس کی سنگینیں ان کی

رہنمائی کر رہی تھیں ۔ انھیں فتح ہوئی لیکن کیا
یہ ہماری شکست تھی ؟ — اگر گولیوں کی بارش
میں پانچ سو نوجوان دس ہزار حملہ آوروں کا
مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں اور ان کے بعد
بچوں اور بوڑھوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور
بستی کو آگ لگا دی جائے تو کیا اسے مدافعت
کرنے والوں کی شکست کہا جائے گا ؟ اور پھر اگر
کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا
جائے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور
بربریت کے ہاتھوں میں اس کی نوجوان بیٹیاں
تڑپنے، چیخنے اور چلانے کے بعد ختم ہو جائیں
اور پھر ان کی لاشوں کے ساتھ بھی ——
سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے ۔ انھوں نے
مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا ۔ میں حیران
ہوں کہ اب تک زندہ کیوں ہوں ۔ سورج
اب تک کیوں طلوع ہوتا ہے ستارے اب تک

کیوں چمکتے ہیں ؟ یہ خط میں نے ہمیں اس
لیئے نہیں لکھا کہ تم میرے خاندان اور میرے
گاؤں کی تباہی پر اظہار افسوس کرو۔ بہار
میں ایک خاندان یا ایک بستی تباہ نہیں ہوئی
اب تک قریباً سات ہزار انسان مارے
جا چکے ہیں اور چار لاکھ بے خانماں ہو چکے
ہیں لیکن اس قدر تباہی اور بربادی کے باوجود
میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں
کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی ہندو فاشزم
اپنی تمام تخریبی قوتوں کے ساتھ میدان میں
نہیں آیا۔ بہار میں ابھی چھوٹے پیمانے پر
ایک تجربہ کیا گیا ہے ابھی تک وہ خنجر جو
عدم تشدد کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں
پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے۔ ہندو فاشزم
کے آتشیں پہاڑ سے صرف چند چنگاریاں نکلی
ہیں اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں

بالخصوص اکثریت کے صوبوں کے مسلمان جن
کی قوت مدافعت کے ساتھ اقلیت کے صوبوں
کے مسلمان اپنی زندگی اور بقاء کی امیدیں وابستہ
کر چکے ہیں اگر ہمارے لیئے نہیں تو کم از کم اپنی
بقاء کی جنگ کے لیئے ہی پنجاب کے مسلمانوں کو
تیار کرو۔ اگر بہار کے واقعات کے بعد بھی
آپ لوگوں کی آنکھ نہ کھلی تو اس کا مطلب یہ
ہوگا کہ ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔" [1]

اس خط کے ذریعہ ناول نگار نے بہار کے مسلمانوں پر کیئے گئے
مظالم کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں وہ اس بات کا بھی
خیال رکھتا ہے کہ ان انسانیت دوست ہستیوں کا بھی ذکر کرو
جن کی وجہ سے قربانی اور ایثار کا جذبہ زندہ تھا۔ ناول کا
ایک کردار مہندر ناصر کا خط پڑھ کر سلیم سے کہتا ہے

"کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔ کاش مجھ
جیسے ایک آدمی کی قربانی تباہی اور ہلاکت

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۲۸۶ - ۲۸۸

کے اس طوفان کو روک سکتی۔ میں دیکھ رہا ہوں
کہ یہ طوفان کسی دن یہاں بھی آئے گا۔ ہندو فاشزم
انسانیت کو ختم کرنے کے لیے جو چتا تیار کر رہا ہے
پنجاب میں میری قوم اس کا ایندھن بنے گی۔ بھائی
سلیم! اس آگ کو یہاں آنے سے روکیے ورنہ
پانچ دریا کسی دن سرخ ہو جائیں گے۔ لیکن ہمیں
آپ اسے نہیں روک سکتے۔ اسے کوئی نہیں روک
سکتا۔ میری قوم ان فاشسٹوں کو اپنے گرد و پار
استعمال کرنے کی اجازت دے چکی ہے سکھ مسلمانوں
کا گھر جلانے کے شوق میں اپنے گھر بھی جلا ڈالیں
گے اور ہندو آگ اور تیل مہیا کرنے کے بعد مزے
سے تماشا دیکھے گا ..... اس وقت مجھ جیسے
لوگوں کی آواز کوئی نہیں سنے گا اس وقت ایسی
آواز نکالنے والے آدمی کا مکمل گھونٹ دیا جائے
گا۔" [1]

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۲۹۱

پندرہ اگست کو دہلی میں ابھی آزادی کا سورج پوری طرح طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ آزادی کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا اور اس کے آتشیں مواد کا رخ اس جانب کر دیا گیا جہاں مسلمانوں کو پاکستان کے دفاعی حصار کی بنیادیں رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔

پندرہ اگست کو انگریزوں نے پتھر کے زمانے کی وحشت اور بربریت کو بیسویں صدی کے جنگی مشینوں پر سوار کر دیا اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ ریڈکلف نے پوری کر دی۔ ریڈکلف کا قلم ستلج یا بیاس کے کنارے رکنے کے بجائے راوی کے کنارے جا پہنچا ان کی منطق سو فیصدی مہاسبھائی تھی۔ ستلج بیاس اور راوی کے درمیان مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے ساتھ شامل کر دینے سے نہروں اور ریلوں کے انتظام میں خلل اور انتشار کا خدشہ تھا جو کہ امرتسر کی دو تحصیلوں میں سکھوں اور ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لیے امرتسر کے سارے ضلع کو ہندوستان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا بیاس کے پار مسلم اکثریت کی تمام تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دی گئیں۔

جس انداز سے ناول نگار نے واقعات کا تانا بانا بننے

کی کوشش کی ہے اس کے مطابق مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے
بعد لارڈ ماونٹ بیٹن ہندوستانیوں کو ایک اور تحفہ کشمیر کی صورت
میں دینا چاہتا تھا۔ اگر دریائے ستلج سرحد بنتا تو ہندوستان کے راستے
میں ستلج اور بیاس کے درمیان ایک وسیع علاقہ اور اس کے بعد یہ
ضلع گورداسپور حائل ہوتا تھا۔ ماونٹ بیٹن نے ۳ رجون کے
اعلان میں ستلج اور بیاس کے درمیان مسلم علاقے ہندوستان کو دے
چکا تھا اب ہندوستان کے راستے میں آخری پتھر صرف ضلع گورداسپور
تھا اس پتھر کو راستے سے ہٹانے کا کام ریڈکلف سے لیا گیا۔ اگر ضلع
گورداسپور تحصیل امبالہ اور بیاس کے پار ضلع فیروزپور میں مسلم
اکثریت کی تمام تحصیلیں ہندوستان کے حوالے نہ کی جاتیں تو اس کے چار
نتائج نکلتے۔ ایک یہ کہ سکھوں کی بہت بڑی تعداد پاکستان میں چلی جاتی
اور انہیں جارحانہ اقدام کی جرات نہ ہوتی۔ اگر مناد ہوتا بھی تو
ستلج اور بیاس کے درمیان اقلیت کے علاقوں کے مسلمانوں کو فوراً
اپنی اکثریت کی تحصیلوں میں پناہ مل جاتی اور اگر امرتسر کی دو
تحصیلوں میں سکھ کوئی زیادتی کرنے کا ارادہ کرتے تو انہیں یہ سوچنا
پڑتا کہ تحصیل امبالہ اور ضلع گورداسپور کے سکھوں پر اس کا کیا اثر پڑے

گا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندو فاشزم مشرقی پنجاب کو آگ اور خون کا پیغام دینے کے بعد کشمیر کی وادیوں کا رخ نہ کرتا۔ تیسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے زیادہ مضبوط ہوتا اور چوتھا یہ کہ مشرقی پنجاب کی سرزمین لاکھوں مسلمانوں کے خون سے لالہ زار نہ ہوتی اور پاکستان کی بنیادیں ہلانے کے لیئے ہندوستان زخمی، ننگے اور بھوکے مہاجرین کے قافلے بھیجنے کا حربہ آزمانے میں اپنا فائدہ نہ دیکھتا۔

ریڈیو پر باونڈری فیصلہ کے اعلان کے ساتھ ہی چند گھنٹوں کے اندر پولیس کے تمام مسلمان ملازم غیر مسلح کیئے جا چکے تھے اور گاؤں کے وہی سرکردہ لوگ جنھوں نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے لیئے حلف اٹھایا تھا اب مسلمانوں پر حملہ کرنے کی پوری طرح تیاری کر چکے تھے۔ سیٹھ رام چند تقریر کر رہا تھا

"میرے سکھ بھائیو! تم پنجاب کے شیر ہو

گرو گوبند سنگھ کے نام کو دھبہ نہ لگانا تمہیں

اس بات پر خوش نہیں ہونا چاہیئے کہ پنجاب

کے چند ضلعے تم کو مل گئے ہیں۔ میرے بھائیو!

مسلمانوں کا پاکستان بن گیا ہے لیکن تمہارا خالصتان
ابھی نہیں بنا۔ کانگریس نے اس صوبے کے چند ضلع
تم کو دے دیئے ہیں اب اس علاقے کو خالصتان
بنانا تمہارا کام ہے اور اسے تمہاری کرپانیں ہی
خالصتان بنا سکتی ہیں ..... مسلمانوں نے
پاکستان مانگا تھا ان کا پاکستان بن گیا ہے اس
لیئے انھیں وہاں بھیج دو۔ جب مشرقی پنجاب
سے ساٹھ ستر لاکھ مسلمان وہاں پہنچیں گے
تو پاکستان کو ہوش آجائے گا۔ بہادر وا ہت
کرو اب پولیس تمہاری ہے، فوج تمہاری ہے،
حکومت تمہاری ہے۔ لیکن جو کام تمہارے
ذمہ ہے وہ تم ہی کو کرنا ہوگا۔ اگر تم نے حملہ
نہ کیا تو کوئی اور جتھہ رحمت علی کے گھر سے
ڈولیاں لے جائے گا اور تم منہ دیکھتے رہ
جاؤ گے!" [1]

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۳۵۸

سلیم کا ساتھی مہندر سنگھ سکھوں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

"میں مانتا ہوں کہ تم مشرقی پنجاب سے مسلمانوں
کو نکال دو گے تم اپنے ان پڑوسیوں کے گھر
جلا دو گے جن کو تم نے گرنتھ اور گائے پر ہاتھ
رکھ کر دوستی کا یقین دلایا تھا جو بندوق
ہندو نہیں چلا سکتا وہ اس نے تمہارے کندھے
پر رکھ دی ہے ..... آج تم جن
پر حملہ کرنا چاہتے ہو انھوں نے دن رات ہمارے
گھروں پر پہرہ دیا ہے انھوں نے ہماری ماؤں
اور بہنوں کو اپنی مائیں اور بہنیں سمجھا ہے"۔ [1]

جب سکھوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا تو چودھری رحمت علی کی
حویلی میں بھی ایسے سرفروشوں کا گروہ موجود تھا جو آخری دم تک
لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے سکھوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا
لیکن سکھوں کی ایک ٹولی نے عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے کمروں
پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ لوگ چلا رہے تھے

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۳۶۳ - ۳۶۵

"میری ماں، میری بیوی، میرے بچے، میری
بہنیں! اور اس کے جواب میں وہ آگ کے
شعلوں کو دیکھ رہے تھے آگ میں جلنے والوں
کی چیخیں سن رہے تھے۔ حملہ آوروں نے
ماؤں، بہنوں، بیویوں، بچوں اور زخمیوں
کی آوازیں دینے والوں کو تھوڑی دیر میں
ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا لیکن آگ دیر
تک جلتی رہی، چیخیں دیر تک سنائی دیتی
رہیں اور آگ لگانے والے ان چیخوں کا
جواب قہقہوں سے دیتے رہے اور پھر وہ
نعرے لگا رہے تھے۔ بینتھ کی جے۔ خالصتان
کی جے۔" [1]

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے لدھیانہ رہتک، کرنال اور گڑگاؤں کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی داستان دوسرے اضلاع کے مسلمانوں کی سرگزشت سے مختلف نہ تھی۔

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۴۴۸

ہر شہر اور ہر بستی سے لٹے ہوئے ننگے، بھوکے انسانوں کے قافلے
قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑتے ہوئے پاکستان کا رخ کر رہے تھے
بیوی کو شوہر کا علم نہ تھا بھائی کو بہنوں کا پتہ نہ تھا مائیں شیر خوار
بچوں کو پھینک کر بھاگ رہی تھیں اور وحشت و بربریت کا
طوفان ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پناہ گزینوں کی گاڑیاں پاکستان
میں لاشوں کے انبار لے کر پہنچ رہی تھیں۔ مشرقی پنجاب میں
ریلوے کے غیر مسلم ملازمین بلوائیوں کو باخبر رکھتے کہ پناہ
گزینوں کی فلاں گاڑی فلاں وقت پر پہنچ رہی ہے اور وہ
اس پر حملہ کرنے کے لیے راستے کے کسی اسٹیشن پر جمع ہو جاتے
مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور عورتیں چھین لی جاتیں۔ اگر صحتوں
کی آمد میں دیر ہوتی تو راستے کے اسٹیشنوں کے ملازم گاڑیوں کو
روک لیتے۔ جو سکھ ڈوگرہ اور گورکھا سپاہی ان گاڑیوں کی حفاظت
پر متعین ہوتے خود بھی اس قتل و غارت گری میں شریک ہو جاتے۔
صرف وہ گاڑیاں پاکستان تک سلامت پہنچتیں جو مسلمان سپاہیوں
کی حفاظت میں لائی جاتی تھیں۔ پاکستان مسلمانوں کی آخری
پناہ گاہ بن چکا تھا۔ ہندوستان سے اسی لاکھ مسلمان ہجرت

کر کے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ جونا گڈھ پاکستان میں شامل ہو چکا تھا
چوں کہ وہاں کا حکمران مسلمان تھا اور رعایا کی اکثریت ہندو تھی اس
لیئے وہاں ہندوستان کی فوج بھیج دی گئی کشمیر کی نوے فیصد رعایا مسلمان
تھی لیکن راجا ہندو تھا اس لیئے وہاں ہندوستان کی فوج بھیج دی گئی
لیکن ہندوستانی حکومت کشمیر میں فوجی اقدام کرنے سے پہلے پاکستان
میں پٹھان اور غیر پٹھان کی تفریق کو ضروری سمجھتی تھی وہ پاکستان
میں نسلیت کا بت کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور پٹھانوں کو
پاکستان سے علیحدگی کا مشورہ دے رہی تھی لیکن یہ سازش کامیاب
نہ ہو سکی۔ کشمیر کی جنگ کفر و اسلام کی جنگ میں تبدیل ہو گئی جہاں
سرحدی قبائل پنجاب، بلوچستانی اور سندھی مجاہدین ایک دوسرے
سے کاندھا ملائے آگے بڑھ رہے تھے۔

ناول کا اختتام سلیم کے قوم کے نام پیام پر ہوتا ہے
جو اس نے کشمیر کے محاذ جنگ سے کیا تھا۔ وہ اپنے پیغام کے ذریعہ
قوم میں اپنے دفاع کے لیئے جوش و جذبہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ
پیغام یہ تھا۔

"اے قوم! تو نے تاریخ انسانی کا سب سے

تاریک دور دیکھا ہے۔ دنیا میں ظالم اور
مظلوم کی داستان بہت پرانی ہے انسانیت
کے خرمن پر کئی بجلیاں گری ہیں باغ آدم
میں کئی آندھیاں آئی ہیں وحشت اور
بربریت کے ہاتھوں نے بارہا انسانیت
کا منہ نوچا ہے لیکن آگ اور خون کا جو
کھیل تو نے دیکھا ہے وہ کسی اور نے نہیں
دیکھا۔ تیرا ادیب اور تیرا شاعر تجھے
دلکش افسانے سنانے اور میٹھے راگ سنانے
کے لیئے آیا تھا۔ ..... لیکن تو خاک اور خون
میں لوٹ رہی تھی وہ تیری محفل میں کلیوں
کی مسکراہٹ اور تمریوں کے ترانوں کا
طلبگار تھا لیکن اس کے سامنے خون کی ندیاں
راکھ کے انبار اور لاشوں کے ڈھیر تھے
وہ تیرے قدموں پر ستاروں کی مسکراہٹیں
قوس قزح کے رنگ اور روئے زمین کی تمام

دلفریبیاں اور رعنائیاں بخشا دکرنا چاہتا
تھا لیکن اس کے سامنے لٹی ہوئی عصمتیں تھیں۔
اے قوم! میں تیرے لیئے مشرقی پنجاب سے
آگ کی چنگاریاں لے کر آیا ہوں جو تیرے بچوں
کو جلا چکی ہے۔ میں تیرے لیئے ان کی پھٹی ہوئی
قباؤں کے ٹکڑے لے کر آیا ہوں جو تیری بیٹیوں
کی عصمت کے خون سے داغدار ہیں میں تجھے دکھن
نغمے نہیں بلکہ وہ جگر دوز چیخیں سنانے آیا
ہوں جو اب تک دہلی اور پنجاب کی فضاؤں
میں گونج رہی ہیں۔ میں تیرے ساتھ آگ سے
کھیل چکا ہوں خون میں نہا چکا ہوں میرا ماضی
اور حال تیرے ماضی اور حال سے وابستہ ہے
اور میرا مستقبل تیرے مستقبل سے جدا نہیں۔" [1]

ناول میں جہاں پاکستانی قوم کی توجہ ان کمزوریوں کی طرف مبذول
کرائی گئی ہیں وجہ ہے اسے اس بربادی و تباہی سے گزرنا پڑا

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۶۱۰

وہی نام نہاد لیڈروں کی خود غرضی بھی دکھائی گئی ہے۔

"عام لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے

بعض پہلے ہی لاہور پہنچ کر وزارتوں اور

عہدوں کی کرسیوں کا طواف کر رہے تھے بعض

لاہور کو بے رونق سمجھ کر کراچی کے جشن

میں حصہ لینے کے لیئے چلے گئے تھے اور باقی

حضرات کے متعلق لاہور ریڈیو کے اعلانات

نشر ہو رہے تھے کہ فلاں لیڈر فلاں صدر

فلاں سکریٹری اور فلاں ایم ایل اے بخیر و

عافیت لاہور پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے

بیان کیا کہ مشرقی پنجاب کی صورت حال

تشویشناک ہے ان کے رشتہ داروں کو

مطلع کیا جاتا ہے کہ کوٹھی نمبر فلاں اور فلاں

میں ان سے ملیں۔" [1]

نسیم حجازی چونکہ تاریخی ناول نگار ہیں اس لیئے اس ناول میں

---

[1] "خاک اور خون" نسیم حجازی ص ۶۱۵

بھی انھوں نے تقسیم ہند کی سیاسی تاریخ قلم بند کی ہے۔ ناول پر
مسلم لیگی نظریہ غالب ہے جس کی رو سے کانگریس کو ان فسادات کا
ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جو تقسیم ہند کی وجہ سے رونما ہوئے۔ یہ الگ
مسئلہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار کون ہیں؟ بقول خشونت سنگھ

"کیا ہندو لوگ کے علمبرداروں کا یہ الزام
درست ہے کہ ملک کی تقسیم کے لیئے صرف مسلمان
ذمہ دار ہیں؟ بالکل لغو الزام ہے ویسے
بھی یہ موضوع اتنا وقیع اور گنجلک ہے کہ
آسانی سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی ہے کہ ملک
کی تقسیم کے لیئے کوئی ایک فرد یا ایک فرقہ
ذمہ دار ہے جناح بذات خود ایک روشن
خیال اور تقسیم مخالف انسان تھے دراصل
کانگریس کی بعض پالیسیوں نے انھیں علیحدگی
کے راستے پر چلنے کے لیئے مجبور کیا۔ کیبنٹ مشن
کی ناکامی جسے پہلے پنڈت جی نے قبول کیا اور
پھر اس سے مکر گئے یہی میرے خیال میں تقسیم

کی ذمہ دار ہے پنڈت جی کو بھارت کا وزیر اعظم
بننے کی بے حد خواہش تھی جنون کی حدوں کو چھوتی
ہوئی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے
ملک کا بٹوارا گوارا کر لیا۔" [1]

بہر حال تقسیم کے ذمہ دار چاہے کوئی بھی رہے ہوں تقسیم کی وجہ سے جو تباہی اور بربادی ہوئی جس بربریت اور شیطانیت کا اظہار انسانوں نے انسانوں کے ساتھ کیا وہ انسانیت کے چہرہ پر بد نما داغ ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک ہندو اور سکھ جتھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر مار دھاڑ اور آتشزنی کی کہ آناً فاناً سارا مشرقی پنجاب اس کی لپیٹ میں آگیا اور پھر دہلی، اجمیر، یوپی کے شمالی اضلاع اور بھرت پور سے لے کر جموں و کشمیر تک کی تمام ریاستیں اس کی زد میں آگئیں وہ آبادیاں جو صدیوں سے امن کی زندگی بسر کر رہی تھیں جن کے تصور میں بھی یہ قیامت خیز مناظر نہ تھے تباہ ہو گئیں سارا نظام معیشت درہم برہم ہو گیا ہزاروں مرد، عورتیں

---

[1] "اردو بلٹز" (ہفت روزہ) ۱۵ر جولائی ۱۹۹۳

اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ لاکھوں بے گھر ہوئے اور ہجرت پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ حکایات خونچکاں ہیں جنھیں نسیم حجازی نے اپنے ناول "خاک اور خون" میں پیش کیا ہے۔ نسیم حجازی نے اپنی بصیرت سے جن خطرات کا ذکر ناول میں کیا ہے وہ پوری طرح ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد آج تک بھی آزادی اور بقا کے دشمنوں کا نصب العین اکھنڈ بھارت ہے تاکہ سارے ملک میں ہندو تہذیب و تمدن کی برتری کا سکہ رائج ہو سکے۔

# میرے بھی صنم خانے

## سفینۂ غمِ دل

## آخر شب کے ہم سفر

## آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے"
ہے۔ اس میں انھوں نے برطانوی عہد کے جاگیر دارانہ طبقے کی
خوش حالی اور آخر میں اس کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس ناول
میں انھوں نے اودھ کی مشتی ہوئی تہذیب کا خاکہ اس انداز میں پیش
کیا ہے کہ اودھ کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی آئینہ کی طرح ہمارے
سامنے آجاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول دوسری جنگ عظیم سے
شروع ہو کر تقسیم ہند پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے تمام سیاسی و
سماجی حالات سے ناول کے کردار متاثر ہوتے ہیں۔ کروا ہاراج کے
کنور عمر خان علی عمران منزل کے مالک ہیں۔ رخشندہ بیگم، پولو
اور پی چو ان کی اولادیں ہیں۔ رخشندہ بیگم، پولو اور پی چو کے کالج
کے دوست کرن بہادر، گنی کول، ڈالمنڈ کرسٹابل وغیرہ ہیں جو
خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں جدوجہد آزادی
کے ساتھ ساتھ زمینداری نظام کے خلاف بھی تحریک چلائی جارہی تھی۔
خاندان کے اصول کے خلاف پی چو انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لیتا

ہے اور لکھنو کی ملٹری پولیس میں اس کا تقرر ہوتا ہے۔

قوم پرستی کے عناصر کو فروغ دینے کے لیے پی چو،
رخشندہ اور اس کے دوستوں نے مل کر نیو ایرا رسالہ نکالنا شروع
کیا۔ نیو ایرا کے جواب میں مسلم لیگ کے لیڈروں نے ملت بیفا کا
اجرا کیا۔ مسلم لیگ کی سیاست پر رخشندہ اور کرن کی گفتگو ملاحظہ
ہو۔

"ہمیں پتہ نہیں دلّی سے لیڈران قوم آئے ہیں
انھوں نے اپنا اسٹڈی سرکل قائم کیا ہے۔ کل
میاں سے ملنے بھی تشریف لائے تھے کہ انھیں
کچھ عطیے سے نوازا جائے۔ ..... یہاں کی
ملت بیفا میں قومی شعور پیدا کرنے کے لیے۔ کیوں
کہ ہماری قوم کو اکثریت سے پس جانے کا سمنت
اندیشہ لاحق ہو گیا ہے میں نے ان سے کہا آپ
اپنے یہ ایڈوکیٹر کسی اور جگہ کے لیے اٹھا رکھیے
تو وہ کہنے لگے کہ آپ کی پارٹی اور آپ کا
رسالہ شیشوں کے گھروں میں محفوظ ہے

آپ کی زمین اور زندگیاں صرف ہمارے
رحم و کرم پر منحصر ہیں کیوں کہ الحمد وللہ
ملت اب ہماری آواز پر لبیک کہنے کو
تیار ہے۔"[1]

ناول نگار نے نیو ایرا اور ملت بیفا کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف تحریکات کو پیش کیا ہے۔ رخشندہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے اسی کے محور پر پوری کہانی گردش کرتی ہے۔ اور سارا گروہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ جاگیر دار طبقہ کی جدید نسل سے تعلق رکھتا ہے جن کے خاندانی رسم و رواج دم توڑ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر طبقات کی نمائندگی بھی کی گئی ہے جہاں جاگیر دارانہ شان و شوکت کے ساتھ کچھ خاندانوں میں قدیم اور جدید کا تصادم بھی ملتا ہے۔ چناں چہ رخشندہ ایک ترقی پسند لڑکی ہے جو سماج کے اندر تبدیلیاں چاہتی ہے اور سماج میں پھیلی ہوئی دقیانوسیت سے ٹکرانا چاہتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔ اس کے باوجود وہ خوش باش ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۵۵

"دنیا میں ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے اور
اللہ میاں مزے سے اپنی جنت میں
تشریف رکھتے ہیں اس نے محسوس کیا کہ
وہ بہت خوش ہے دنیا سے اس کی مکمل
صلح ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ مزے کی
باتیں کرے۔ سائیکل پر بنارس باغ کی
خاموش اور سایہ دار سڑکوں کے چکر
لگائے۔ ڈالمنڈ کرسٹائل اور روما اور
اپنی دوسری سہیلیوں کی پوری بریگیڈ
کے ساتھ اسی وقت نیو انڈیا کافی ہاؤس
پہنچ جائے اور وہاں اپنے پسندیدہ کونے
میں اکڑوں بیٹھ کر خوب چلا چلا کر باتیں
کرے اور قوالی گائے غسل خانے میں گھس
کر بلی چوکے سارے سگریٹ پی ڈالے اور
اپنے دوستوں کو فون پر خبر سنائے کہ وہ
غم دوراں اور غم جاناں کی ہر فکر سے آزاد ہے"۔ [1]

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۵۰ - ۵۱

تقسیم ملک کے ساتھ ہی منادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔
قرۃ العین حیدر نے اپنے زورِ قلم اور حقیقت نگاری سے بڑا کام لیا اور
منادات کی صحیح اور موثر عکاسی کی ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے
اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"مسلمان خوف و ہراس سے سہمے جاتے
تھے انہوں نے مکانوں اور کوٹھیوں
پر سے اپنے ناموں کے بورڈ اتار لیے
تھے ریل کے سفر کرنے کے لیے ہندو نام
تجویز کر لیتے تھے۔" [1]

"پہلے تو مسلمانوں کو پاکستان دلوایا اب
کھڑے روتے ہیں ایک ایک مسلمنے کو
چن چن کر نکالا جائے تب ہمارے
من میں ٹھنڈک پڑے گی۔" [2]

"روشن ڈارلنگ تم مسلمان ہو اس

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۱۷۴

[2] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۱۸۴

لیئے بندی لگا کر روکشینز کیمپ تک ہمارے
ساتھ چلنا ہے چار سے شرنارتھی مسلمانوں کے نام
سے اب اتنی نفرت کرتے ہیں کہ وہ لمتیں دیکھنا
برداشت نہ کر سکیں گے۔ روشن ڈارلنگ تم
یہاں غرارے مت پہننا اچھا۔ اور رومانہ تم
اپنے ملک میں اپنے وطن میں شیر شاہ، اکبر
اور شاہجہاں کی دلّی میں مسلمان ہونا جرم تھا
خطرہ تھا۔ شرم تھی۔" [1]

قرۃ العین حیدر نے تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد کی ہے اور کانگریس کے لیڈروں کی روشن خیالی کو دکھایا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد آخر وقت تک کوشش کرتے رہے کہ کسی بھی طرح ملک کی تقسیم روکی جا سکے۔

"خدا کے لیئے اس پلان کو منظور نہ کرو اس کا
نتیجہ انتہائی تباہ کن ہوگا..... کیبنٹ
مشن کی تجویز اب بھی مان لو..... اب

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۵۷

بھی موقع ہے ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا
قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہم صدیوں تک سنبھل
نہ سکیں گے لیکن ان سے کہا گیا ہے کہ کچھ نہیں
کیا جا سکتا وہی ہو گا جو طے کر لیا گیا ہے وہ
مایوس ہو کر اس روتی ہوئی اندھیری
رات کے سناٹے میں اپنے گھر لوٹ آئے۔" [1]

اس طرح نہرو نے بھی دہلی میں فساد کے دوران قوم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب انھیں فون پر یہ اطلاع ملی کہ جامعہ ملیہ پر حملہ کیا گیا ہے تو یہ خبر سنتے ہی ۱۲ بجے رات کو اکیلے نہرو جامعہ ملیہ پہنچتے ہیں لیکن یہ اطلاع جھوٹی ثابت ہوئی اور جب انھیں مکتبہ جامعہ کے جلنے کی خبر ملی تو ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"ارے یہ کیا غضب کر رہے ہو اس مکتب کو
تو جو رو یہ محض کاغذوں کا انبار نہیں ہے ایک
پوری نسل کا سرمایہ ہے قوم کی عزیز ترین دولت
ہے مستقبل کے لیے ہماری زاد راہ ہے۔" [2]

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۴۶۴
[2] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۴۵۴

مسلم لیگ نے جس کلچر اور زبان کے تحفظ کے لیئے ایک الگ آزاد ملک کا مطالبہ کیا تھا اس میں وہ علاقے شامل نہ ہو سکے جہاں میں اس تہذیب نے پرورش پائی تھی۔ لکھنو جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کا گہوارا تھا پاکستان میں شامل نہ ہو سکا لکھنو میں بلوچستان اور پنجاب سے مہاجر آکر بسنے لگے جس سے لکھنو کا کلچر تبدیل ہو گیا۔ مسلم لیگیوں کو اس بات پر کف افسوس ملتے دکھایا گیا ہے۔

"ارے میاں جن قوم پرستوں کو پچھلے آٹھ
سال سے گالیاں دیں اب ان ہی کے دروازوں
پر پہنچا پڑ رہا ہے کہ بھائی خدا کے لیئے بتاؤ اب
ہم کیا کریں۔ میاں ہم تو ادھر کے رہے نہ ادھر
کے ..... ہم کو تو ایسا فراموش کیا گیا
گویا ہم اور ہمارے کام کی کوئی اہمیت ہی نہیں
تھی۔ دوسرے نے کہا این کا سب سالے مذاق
اڑاتے ہیں کہ وہ دن گئے جب آپ ناخنہ اڑاتے
تھے اب پڑھیئے بال شکشا ورنہ لیجیئے اپنے وطن
مطلوبہ کا راستہ..... جس کلچر روایات

اور زبان کے تحفظ کے لیے یہ ساری قیامت
اٹھائی گئی تھی ان علاقوں میں جنھیں حاصل کیا
گیا ہے وہ کلچر وہ زبان کہاں ہے جس کے مرکز
اور گہوارے اور اپنی تاریخ و تمدن کی ساری
وراثت تو خود اپنے ہاتھوں سے ہم نے دوسروں
کو سونپ دی۔" [۱]

تقسیم کے بعد مسلمان ہندوستان میں بدحالی کا شکار ہو گئے۔ ان کو سرکاری نوکریوں سے بر طرف کر دیا گیا۔ ان کے کاروبار ختم کر دیئے گئے۔ مسلم معاشرت کی بدحالی اور لکھنو کے ماحول کی تبدیلی کا بیان بھی بڑے خوبصورت انداز سے کیا گیا ہے۔ ان کو لکھنو اور اس کی تہذیب سے بے انتہا محبت ہے۔ تہذیب کی تبدیلی کو انھوں نے ایک لکھنوی کی حیثیت سے محسوس کیا ہے۔

"لکھنو کے قہوہ خانوں اور تفریح گاہوں
کی رونق پہلے سے دوگنی ہو گئی تھی۔ فیشن
ایبل دوکانوں پر چاندی برس رہی تھی اکثر

---

[۱] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۱۹۱ - ۱۲۱

شاموں کو حضرت گنج پر بالکل لاہور
کے ماحول کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ہر روز نت
نئے پروگرام اور آزادی منانے کے جشن
منعقد کیے جا رہے تھے ..... مسلمانوں
کو ریلوں کی کھڑکیوں سے باہر پھینکا جا رہا
تھا ..... مسلمانوں کے کاروبار
معطل ہو چکے تھے۔ انہیں ہر جگہ کتے سے
بدتر سمجھا جا رہا تھا اور کتے کی موت
مارنے کے ارادے کیے جا رہے تھے۔
کل بھارت کوی سمیلن منعقد ہونے
والا تھا ہر طرف بڑا شدید قومی جوش
و خروش طاری تھا مسلمان خوف و
ہراس سے سہمے جاتے تھے انہوں نے اپنے
مکانوں اور کوٹھیوں پر اپنے ناموں کے
بورڈ اتار دیئے تھے۔ ریلوں میں سفر کے
لیئے ہندو نام تجویز کر لیئے تھے .....

مسلمان زمیندار کو اپنی عاقبت نظر آ رہی
تھی کاروباری الگ ہاتھ پیر ہاتھ دھرے رہ
رہے تھے۔ ملازمت پیشہ مسلمانوں کو
بہانے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نوکریوں سے
ہر طرف کیا جا رہا تھا۔" [1]

تقسیم ہند کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب۔ آرٹ اور کلچر مختلف مذاہب مختلف فرقے کے لوگوں کا مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے اسے ہم کسی مخصوص قوم یا فرقے تک محدود نہیں کر سکتے۔ ملک کی تو تقسیم ہو گئی لیکن اس ادبی سرمائے کو تقسیم نہیں کیا جا سکا۔ تقسیم کے بعد بھی اردو ادب میں جوش اور نذر الاسلام شامل رہے۔

"ارے تم نے فوجیں، سرکاری ملکے، توپیں
مشین گنیں، ہتھیار تو تقسیم کر لیے لیکن ہمارے
اس مشترکہ تمدن۔ ہماری موسیقی، ہمارے
ادب، ہمارے آرٹ کا کیا ہوگا؟ کیا اب

---

[1] "میرے بھی صنم خانے"، قرۃ العین حیدر ص ۱۱۷-۱۱۸

تم یہ کہو گے کہ یہ ہندو موسیقی ہے یہ مسلم موسیقی
ہے یہ خالص اس ڈومنین کا آرٹ ہے یہ صرف
اس ملک کا فن ہے۔ کوکل اور بچن اور نزالا
صرف ہندوؤں کے لیئے ہیں۔ نذرالاسلام اور
جوش فقط مسلمانوں کے لیئے ہیں"۔ [1]

اس ناول کا اصل تھیم فسادات کے زمانے کا وہ ہندوستان ہے
جب ملک کے سارے نیتا قومی روایات کی باتیں کرتے تھے۔
مسلم معاشرے کے دلدادہ اپنی تعریف اور عیش و آرام میں مصروف
تھے اور آزادی نے تمام ولولے اور عیش و عشرت کے سامان
ختم کر دیئے تھے پوری معاشرت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔
قرۃ العین حیدر نے ان تمام حالات کو اپنے ناول میں ان تمام جزئیات
کے ساتھ فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے جس طرح اس دور میں
زندگی کا شیرازہ منتشر ہوا تھا اسی طرح ناول کے تمام کردار بکھر
جاتے ہیں۔ پی جو قوم پرستوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ کرن کو قبائلیوں
کی گولی نے ختم کر دیا۔ رخشندہ اکیلی رہ گئی۔ اس کے خواب شرمندۂ

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۵۷۴

تعبیر نہ ہو سکے اور ناول کے آخری حصہ میں اس کی روح بھٹکتی نظر
آتی ہے جہاں اس کا کوئی رفیق نہیں کوئی مونس و غم خوار نہیں وہ اپنے
اس شہر میں جس کی ایک مخصوص تہذیب اور منفرد کلچر تھا وہاں تنہا
رہ گئی چند دنوں کے حالات نے اسے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ جہاں
کبھی زندگی تھی وہاں اب صرف ویرانی ہی رہ گئی تھی۔

"کروا ہاراج کی رخشندہ آنشدان کے پاس
ایک پرانے سرخ رنگ کے میلے صوفے پر،
جس کے لوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس
گئے تھے اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے بیٹھی رہی
اور بلیں جھپکاتی رہی"۔
سارا دن گزر گیا اس نے پھر دہرایا
دریچے کے باہر ہوائیں زرد پتوں کو ادھر سے
ادھر اڑاتی رہیں. . . . . .
سارا دن گزر گیا۔ کوئی نہیں آیا، کوئی نہیں آیا،
سارا دن گزر گیا"۔ سارا دن گزر گیا۔ کروا ہاراج
کی رخشندہ نے ہاتھ ہلا کر پھر اپنے آپ سے دہرایا،

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔" [1]

اس طرح یہ ناول ایک پوری نسل کا المیہ پیش کرتا ہے جس کے تصور کے ضم خانوں کو تقسیم ہند کے اثرات نے پاش پاش کر دیا تھا۔ اس ناول میں عصری حسیت بہت تیز و تند ہے۔ اس کے اکثر و اہم ترکردار جدت پسند، اپٹوڈیٹ اور فیشن ایبل ہیں رواج زمانہ کے دلدادہ اور بہتر مستقبل کے آرزومند ہیں۔ بہرحال یہ ناول غیر منقسم ہندوستان کی جنگ آزادی کے آخری دور سے تقسیم ہند کے فوراً بعد آزادی کے اولین دور تک کے ماحول پر مشتمل ہے۔

اس ناول میں طبقاتی شعور کی جھلکیوں کے باوجود مٹتے ہوئے اعلیٰ طبقے یا ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا کوئی نقب العین یا مطمئن نظر پیش نہیں کیا۔

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں

"قرۃ العین حیدر نے جاگیردارانہ طبقے کے روشن خیال نوابوں کو مشترک ہندوستانی

---

[1] "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر ص ۴۵۴ - ۴۵۶

تہذیب ہی کا نہیں عالمی تمدن کی اعلیٰ ترین
اقدار کا بھی امین سمجھ لیا ہے اسی لیئے جب زمینداری
ختم ہوتی ہے تو گویا تہذیب انسانی کا خاتمہ
ہوتا نظر آتا ہے یا جب تقسیم ہندوستان ہوتی
ہے تو بھی قرۃ العین اسے محض بلائے ناگہانی
کے طور پر پیش کرتی ہیں ان طبقوں کی ذمہ
داری اس میں نہیں دیکھتیں جو انھیں اتنے
عزیز ہیں۔" [1]

آگے لکھتے ہیں

"وہ تاریخی عمل قرۃ العین نے فراموش
کر دیا جو تقسیم ہندوستان کی شکل میں انجام
پایا۔ یہ نہیں ہوا تھا کہ اچانک انگریزوں
کے جی میں آئی اور وہ ملک تقسیم کر کے چلے
گئے۔ وہ نفرت کی آگ جو دھیرے دھیرے
بھڑکی تھی جس کی ذمہ داری ہمارے اپنے سر تھی۔

---

[1] "جدید اردو ادب" محمد حسن ص ۵۳

ہمارے اپنے تاریخی عوامل کے سرچشمے جس میں
پلی جیسے نہ جانے کتنے نوجوان عملی طور پر سرگرم
تھے ان کے تذکرے کے بغیر ناول ایک رومانی
معصومیت کے ساتھ تاریخی عوامل کے جبر و سزا
پر محض جذباتیت کا ہلکا سا لبادہ ہی ڈال سکتا ہے۔" [1]
"میرے بھی صنم خانے" میں قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک
کو برتتے ہوئے اپنے کرداروں کی نفسیات کے ذریعہ ہندوستانی پس
منظر میں ان قدروں کو پیش کیا ہے جو صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ
پوری انسانی دنیا کا سرمایہ ہیں۔ اس ناول میں انھوں نے "اور انسان
مر گیا" کی طرح مناظرات کو موضوع نہیں بنایا بلکہ وقت کے بہاؤ میں
اس پر آشوب دور کی ہندوستانی زندگی کے کچھ واقعات کو پس منظر
بنا کر کرداروں کی ذہنی کیفیت کا اس منفرد انگیزی سے بیان کیا ہے کہ
ہمیں واقعی اس بھیانک زندگی کے کرب کا شدت سے احساس ہونے
لگتا ہے۔ آزادی کا تصور، آزادی کے لیے ایثار و قربانی اور آزادی
کے خوابوں کی بھیانک تعبیر ان تین لفظوں تراشیدم، پرستیدم، شکستم

---

[1] "جدید اردو ادب" محمد حسن ص ۴۵

میں سمٹ آتی ہے جو اس ناول کے تین حصوں کے نام ہیں۔ اور پیران حصوں کے عنوان "چلی بائے موری نیا کنارے کنارے" "دھنستے ہوئے ساحل" اور "منزل لیلیٰ" اپنی رمزیت کے باوجود ہندوستان کی آزادی کے خواب، حصول آزادی کے وقت مخصوص سیاسی وسماجی فضا اور پھر خوابوں کی بھیانک تعبیر ہم پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ منزل لیلیٰ کی اندوہناک دنیا جس میں "ان گنت مرے ہوئے انسان چاروں طرف سے نیچے گر رہے ہیں نئی سرحد کو عبور کرنے والے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے قافلے پیدل، بیل گاڑیوں پر، خون آلود ٹرینوں میں ادھر سے ادھر ہو رہے تھے"..... یہ اور ایسے ہی منظر ہمیں تقسیم شدہ ہندوستان کی تصویر دکھاتے ہیں۔ اور ناول جو جاگیردار طبقے کے زوال کی داستان کے طور پر شروع ہوا تھا اب محض اسی زوال کی داستان نہیں رہتا بلکہ "پی جو" جیسے قوم پرور کی موت میں علامتی طور پر اس شکست کا کرب بن جاتا ہے جو تقسیم ہند کی وجہ سے مشترکہ ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب کو ہوئی تھی۔ اس طرح ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ سب کیوں ہوا؟

آزادی کے بعد بدلتے ہوئے سماجی پس منظر میں پرانی

اقدار کے مسئلے پر غور و فکر کرنا اس دور کی ناول نگاری میں ایک رجحان بن گیا تھا۔ "میرے بھی صنم خانے" کی طرح قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناول "سفینۂ غم دل" میں بھی اودھ کے ان لوگوں کا ذکر بڑی دردمندی سے کیا گیا ہے جن کی زندگیوں میں اداسی اور مایوسی تھی لیکن وہ خوش باش لوگ تھے جو اپنے دکھوں کے باوجود دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے۔[1] ان میں وہ نئی نسل بھی تھی جو نئی تعلیم سے بہرہ مند تھی اور یورپ کے علمی و ادبی تحریکوں میں دلچسپی رکھتی تھی ان میں وہ بھی تھے جو سوچتے تھے

"...چاروں طرف نیلا کہرا ہے اور بارش۔
پر مستقبل ہے جس کی طرف ایک پل بنا کر ہم اس
پر سے گزرنا چاہتے ہیں لیکن علماء اپنی بحثیں
خود نہیں سمجھ پاتے اور سیاستداں اور فلسفی
مخبروں سے زیادہ فضول ہیں۔۔۔۔۔"[2]

"صدیوں تک ہم اس طرح لڑ مکتے رہے اور

---

[1] "سفینۂ غم دل" قرۃ العین حیدر ص ۳۸

[2] "سفینۂ غم دل" قرۃ العین حیدر ص ۲۸۹

بالآخر یہ یوم حزا ہے شہر ہمارے ہاتھوں
سے نکل چکے ہیں۔ ہمارے نوجوان آگ میں
جا رہے ہیں بوڑھے فالج زدہ ہیں اور عورتیں
چیکے رو رہی ہیں اسلحات کی فیکٹریوں میں
دن رات کام ہو رہا ہے۔ یہ قیامت کا روز
ہے عبادت خانے دعاؤں سے گونج رہے ہیں
ہیلی کاپٹروں نے ہوا ن کنڈوں میں آگ
لہکا رکھی ہے اور زائرین طیارے چارٹر
کر کے مقدس مقامات کی طرف جا رہے ہیں....

.... یہ ہماری موت کا گھنٹہ ہے .....
اس گھنٹے کو خاموش کر دو..... اسے
خاموش کر دو جو مستقل بجے جا رہا ہے...
.... روح جو گردش میں ہے روح جو مستقل
ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کرتی
ہے شاید اسے اپنا ابدی گھر مل جائے گا.....
کیوں کہ ہمیں زندہ رہنا ہے۔" [1]

---

[1] "سفینہ غم دل" قرۃ العین حیدر ص ۳۸۴

ایسی تصویریں اور ذہنی کیفیات کے ذریعہ قرۃ العین حیدر نے ہندوستان اور پاکستان کی پر آشوب زندگی کو پس منظر بنا کر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور وقت کا بہاؤ کن قدروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیے جا رہا ہے۔

اس ناول کا ماحول اور کردار بھی نوعیت کے اعتبار سے وہی ہیں جو "میرے بھی صنم خانے" میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ اور جدید تہذیب کے پروردہ افراد بالخصوص نوجوانوں کے صنم کدوں کی شکست۔ موضوع کی تکرار کا اقرار خود مصنفہ کے بیانات سے ہوتا ہے۔

"لیکن اب تم سے ان اکیلے صنم خانوں کا ذکر نہ کروں گی میں نے جنہیں وہ بتلایا ہے جو وقت کے ساتھ گزرا۔" [1]

ناول تحریک آزادی کے نقطۂ عروج ۴۳ء کے آس پاس کے دور اور ماحول سے شروع ہو کر تقسیم ہند اور اس کے قریبی زمانے کی چند جھلکیوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نئی نسل کی شکست آرزو کی پر درد

---

[1] "سفینۂ غم دل" قرۃ العین حیدر ص ۳۸۳

داستان ہے جس میں مصنفہ اور اس کے ہم عصروں کے شیریں خوابوں
اور ان کی ہولناک تعبیروں کا بیان ہے۔

"کیسے میں مٹی پر بیٹھ کر اس پرانی ندی کے کنارے
اس قدیم امام باڑے کے سائے میں جب کہ سورج
آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے اپنا اپنے آباو اجداد
کا مرثیہ لکھوں گی؟ کیوں کہ ہم بے حد نااہل ثابت
ہوئے ہماری نسل اس بار کو نہ اٹھا سکی جو امانیاں
تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہمیں سونپا تھا
ہم تمہارے معیاروں پر جو انسانیت، شرافت
اور تہذیب کے معیار تھے پورے نہیں اتر سکے
اس لیے اب ہم جا رہے ہیں۔" [1]

قرۃ العین حیدر نے بے حد پر اثر انداز سے انسانیت کی زبردست
ٹریجڈی کو پیش کیا ہے۔ یہ ٹریجڈی ہندوستان کی تقسیم ہے جس کی وجہ
سے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ایک
ایسی تہذیب، ایک ایسے تمدن اور ایک ایسی ثقافت کو ختم کیا گیا جو

---

[1] "سفینہ غم دل" قرۃ العین حیدر ص ۳۱۲

صدیوں کے اتحاد کی ایک عظیم الشان نشانی تھی اور اس کے ساتھ ہی
انسانیت تعرمذلت میں گر چکی تھی ۔ لوگوں کے اخلاقی معیار بدل چکے
تھے ۔ تہذیب و تمدن جن گرانڈں کی میراث تھی وہی دربدر کی ٹھوکریں
کھا رہے تھے ۔ امام باڑے سنسان اور مسجدیں ویران ہوگئیں تھیں ۔ زندگی
کی پرانی قدریں نفرت کی آندھیوں کی نھینٹ چڑھ گئیں ۔ وہ تہذیب،
ہندوؤں مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد، وہ روایات سب
کچھ ختم ہو گئے تھے ۔ ان ہی سب حقیقتوں کا بیان اس ناول میں روح
کی گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

اسی طرح بنگال کے پس منظر میں لکھا گیا ناول
"آخر شب کے ہم سفر" ہے ۔ اس ناول کے پیش لفظ میں قرۃ العین
رقم طراز ہیں

"بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک،
۱۹۴۲ء کا انڈولن، مطالبہ پاکستان، تقسیم ہند
اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے
اس ناول کے تمام کردار فرضی ہیں"۔

اس ناول کی ایک امتیازی خصوصیت بنگال کے جدید تہذیبی تناظر میں

یہ ہے کہ اس ناول کی ہیروئن ایک عورت دیپالی سرکار متوسط ہندو طبقہ کی ایک تعلیم یافتہ باغی خاتون ہے ناول کے خاتمہ پر یہی خاتون اپنے تمام باغیانہ خیالوں کے باوجود بھیرو راگ گاتی ہوئی اپنے باپ اور پھوپی کی رائے کو ایک غیر ملک سے ہر دوار لے جاتی ہے ان الفاظ پر یہ قصہ تمام ہوتا ہے

"لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع۔" [1]

ناول کے تمام کرداروں کا سفر حیات علامتی طور پر ہندوستان کی جدید تاریخ کے ایک ایسے وقت ہوتا ہے جسے بوجوہ آخر شب کہا جاسکتا ہے۔ یہ تاریک ساعت جنگ آزادی کے آخری دور اور آزادی کے بعد تقسیم ہند کے ہولناک المیہ پر مشتمل ہے۔

ہندو مسلم معاشروں کے ایشیائی ماحول کے ساتھ مسیحی معاشرے کا یورپی ماحول قرۃ العین حیدر کا ایک مستقل موضوع ہے۔ اس ناول میں بھی وہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہندوستان کی نئی نسلیں

---

[1] "آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۹۴

مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب سے بھی ایک تہذیبی ورثہ پا رہی ہیں۔
وہ عیسائیوں کو غیر منقسم ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ
ایک مشترکہ تہذیب کا تیسرا عنصر سمجھتی ہیں اور جدید بین الاقوامی دور
کا مغربی نمائندہ بھی تصور کرتی ہیں۔ یہ تیسرا عنصر بیک وقت ترقی و
زوال دونوں کی علامت ہے۔ حالات کا ارتقاء کچھ اس طرح ہوتا
ہے مشرق کے جو ذہین افراد ایک نئی روشنی کی تلاش میں مغرب کا رخ
کرتے ہیں وہ یورپ کے شہروں بالخصوص انگلستان اور لندن
میں ایک جدید تمدن اور ترقی یافتہ تہذیب کی مادی برکتوں کا
مشاہدہ تو کرتے ہیں مگر ایک روحانی حرارت کا احساس لے کر اپنے
وطن لوٹتے ہیں اور ایک قسم کے تصوف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں
اس کیفیت کا عکس مغرب پر بھی پڑتا ہے اور وہ اپنی مادیت کی
انتہا پسندانہ بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر مشرق کے دامن میں
روحانی سکون کی تلاش کرتا ہے تو ایک طرف "ہپی" پیدا ہوتے ہیں
اور دوسری طرف "سوامی" ابھرتے ہیں دونوں ہی فراڈ اور
انسانیت کی مایوسی کے آئینہ دار ــــ یہ جدید عالمی تمدن کی تازہ
ترین صورت حال ہے جس کی نقاشی قرۃ العین حیدر نے آخر شب کے

ہم سفر" میں کی ہے اس لحاظ سے یہ ناول آج کے عالمی معاشرے کا
سب سے بڑا عکاس ہے۔

اس عکاسی کا مطالعہ کرنے کے لیئے ناول کے دو الواب
شہزاد کرسٹینا بلمونٹ اور سوامی آتم آنند شنکر بیری کافی ہیں۔
پہلے باب کی آخری سطور ملاحظہ ہوں۔

"یہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار تھے
جنہیں آپ کی نسل نے بہت کمزور کیا
ہے مسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں
سے بغاوت کر کے سوامیوں کے ریکٹ میں
پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب
ہیں؟ آپ نے امن کے لیئے کام کیا تھا؟
اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں مسز سین۔
اگر نوجوان لوگ فلاور چلڈرن بن گئے،
آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم
ہوئی وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔" [1]

---

[1] "آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۵۲

دوسرے باب کا خاص کردار ایک انگریز سوامی کہتا ہے

" مجھے اس دولت، عیش و عشرت، کامیابی

گناہ آلود دنیا سے، جو ہوس کی دوڑ سے

نفرت ہو گئی سب مایا ہے۔ میں سنیاس

لے چکا ہوں" [1]

یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرۃ العین حیدر کی روح بھی جس کا جنم اودھ میں ہوا تھا بنگال کی طرف ہجرت کر کے اپنے کرداروں کے ساتھ ہوئے مغرب پرواز کر گئی اور پھر ایک بین الاقوامی خلا میں سرگشتہ و آوارہ ہے خواہ اس کا جسمانی قیام جہاں کہیں بھی ہو؟ اس سوال کے جواب کے لیے ناصرہ نجم السحر قادری کے باب میں اس کے بیانات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

" ہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان

سے ہو کر گزرے ہیں جس کے مقابلے میں آپ

لوگوں کی برطانیہ کے خلاف جد و جہد اور تقسیم

ہند کی خوں ریزی ایک پکنک تھی" [2]

---

[1] " آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۵۵

[2] " آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۷۱

"انتخاب کیا ہونا چاہیئے؟ امن پرستی یا فلسطینی
مجاہد؟ امن یا آپ کے نکسلائیٹ"؟ [1]
"کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے؟" [2]

یہ بالکل نئی نسل کی ایک لڑکی کا ذہن ہے اور انتہائی حد تک باغیانہ اور انقلابی ہے۔ آخر شب کے منظر نامے میں شب انسانیت کا وہ جلوہ نظر آتا ہے جس کا تعلق ہر صغیر کی جدید تاریخ اور اس کے تناظر میں آج کی پوری دنیا سے ہے۔

"اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا
تو آج بنگلہ دیش بھی نہ ہوتا۔ مدر انڈیا کا
تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم پرستوں کو
دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو
تخریب پسند کالی کے روپ میں شکتی کی
پوجا کرتے تھے اور دیبی ماں کے قدیم درا دڑی
تصور کے پرستار تھے اور ان اولین دہشت
پسندوں میں جن کو انگریزوں نے ٹریس

---

[1] "آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۷۳
[2] "آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۷۵

کہا اور ہندوستانیوں نے انقلابی ۔ گاندی اینڈی
مسلم لیگ تھے اور بنگلم چندر کا آنند مٹھ ان کا
آدرش تھا اور "بھدرا لوگ" کی سیاست
اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے
CROSS CURRENTS نے پاکستان بنایا
اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش اور
انفرادی طور پر مختلف لوگوں کی شخصیتوں
کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال
کے CROSS CURRENTS کے اثر سے
افراد کی اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور
بگڑتی رہیں۔" [1]

یہ گہرا جائزہ عصر حاضر کی انسانی تاریخ کا حساب بے باق کر دیتا ہے۔ اور اپنے حدود میں ہر عصر کے عصری تبلکوں کی توجیہہ کر دیتا ہے۔

---

[1] "آخر شب کے ہم سفر" قرۃ العین حیدر ص ۳۷۷

"آگ کا دریا" اردو ناول نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے ڈھائی ہزار سالوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ اس میں تاریخ، فلسفہ، ادب اور جمالیات کا بڑا حسین امتزاج ملتا ہے۔ بقول راہی معصوم رضا

"قرۃ العین حیدر نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ لمحہ جو موجود ہے اس کا ماضی سے کیا تعلق ہے چناں چہ یہ طویل داستان دراصل ایک طویل ذہنی سفر ہے جس کو جگہ جگہ سے دل کی راہیں کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں"۔ [1]

دریا کو قرۃ العین حیدر نے وقت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو زندگی اور موت کے چکر سے بے نیاز ہے کیوں کہ وقت کو کبھی موت نہیں۔ تہذیبیں بنتی اور مٹ جاتی ہیں لیکن وقت کو کبھی فنا نہیں۔ دریا برابر بہتا رہتا ہے اسی دریا کے کنارے تہذیبیں طلوع ہوتی ہیں اور غروب ہو جاتی ہیں۔

---

[1] "آگ کا دریا" راہی معصوم رضا۔ اردو ادب علی گڈھ شمارہ ۲ ص ۱۲

قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" کو تین تہذیبی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ناول ویدک کال سے شروع ہو کر موریہ خاندان کے دور حکومت، مغلوں کا عہد، انگریزی سامراج اور پھر ملک کی تقسیم کے واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ہندوستانی کلچر کو پیش کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ہندوستان میں رہنے والے سب ہی قوموں کی زندگی اور ان کا رہن سہن، ان کا عروج و زوال بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور برباد ہو گئیں اس کے باوجود ہندوستانی تہذیب کی انفرادیت ہر دور میں برقرار رہی۔ قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی تہذیب کی اس امتیازی خصوصیت کو "آگ کا دریا" میں نمایاں کیا ہے۔ وقار عظیم اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں

"قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں
کسی ایک طبقہ یا گروہ کی زندگی یا کسی ماحول
میں رہنے والے انسانوں کی کہانی نہیں کہی بلکہ
انسان کی کہانی کہی ہے اس انسان کی جس کو ہر
دور میں ایک نئی قیامت کا سامنا کرنا پڑا ہے

جوہر دور میں ایک کشمکش میں مبتلا رہتا
ہے جس پر ہر دور میں خوف کے بھیانک
سائے منڈلاتے رہتے ہیں جسے ہمیشہ تنہائی
کے احساس نے ستایا ہے اور رلایا ہے جوہر
ملی میں وقت کے ایک طلسم میں گرفتار
رہتا ہے البتہ اس قیامت کی صورت، اس
کشمکش کی اور خوف کی نوعیت، اس
احساس تنہائی کی کمیت بدلتی رہتی ہے
اور وقت نئے روپ میں ظاہر ہوکر
ان میں سے ہر ایک پر اپنا ایک مخصوص
رنگ شامل کرتا رہتا ہے"۔ [1]

ناول کا پلاٹ ویدک کال سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے کے
طالب علم روح کیا ہے قدر کیا ہے وہ ہے بھی یا نہیں اس قسم کے فلسفیانہ
خیالات میں مصروف رہتے تھے اور اس کی تلاش و جستجو ان کے علم
کا مقصد ہوتی تھی۔ اسی قسم کا ایک طالب علم گوتم ہے جو کوشل دیش

---

[1] "ایک ناول نگار" وقار عظیم ادب لطیف جنوری ۱۹۶۱ ص ۹۷

کے مہا پروہت کا بیٹا ہے اور شراوستی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔
شراوستی ایسی ہی یونیورسٹی تھی جیسی نالندہ، اجین اور ٹکسیلا۔ جہاں
دن رات مناظرے اور بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ گوتم جدید ذہن کا ہونے
کے ساتھ ساتھ بدھ مذہب سے بھی متاثر تھا۔ جب وہ ایودھیا سے
شراوستی جا رہا تھا تو سرجو کے کنارے اسے دو لڑکیاں چمپک اور نرملا
نظر آتی ہیں۔ گوتم چمپک سے متاثر ہوتا ہے لیکن یہ اس کا برہمچاری
جیون تھا جس میں کسی لڑکی کے بارے میں سوچنا بھی پاپ تھا۔ لیکن
وہ چمپک کے خیال کو دماغ سے دور نہیں کر پاتا۔ آشرم میں اس کی
ملاقات ہری شنکر سے ہوتی ہے دونوں کے خیالات میں زمین
آسمان کا فرق ہے۔ کچھ عرصہ بعد شراوستی پر چند رگپت موریا کا
حملہ ہوتا ہے جس میں لڑتے ہوئے گوتم کی انگلیاں کٹ جاتی ہیں۔
چمپک دوسری سہیلیوں کے ساتھ ندی کے اس پار چلی جاتی ہے جہاں
چمپک کی شادی ایک فوجی افسر سے ہو جاتی ہے۔ گوتم انگلیاں کٹ
جانے کے بعد ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے اسی دوران اس کی ملاقات
کاشی کی ناگہ سے ہوتی ہے جو ناگ منڈلی چلاتی ہے وہ اس ناگ
منڈلی میں گوتم کو شامل کر لیتی ہے وہاں ایک ناگ کے دوران گوتم

چمپک کو دیکھتا ہے دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں
چمپک اپنی سہری سے کہلواتی ہے کہ وہ اس سے ملے۔ گوتم انکار کر دیتا
ہے اور کہتا ہے

"پتی ورتا عورت کے لیئے دوسرا مرد
سائے کے سمان ہوتا ہے" [1]

اس جملہ کے ذریعہ ناول نگار نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کے
تقدس اور عظمت کو ظاہر کیا ہے یہاں ناول کا پہلا حصہ ختم
ہو جاتا ہے۔

ناول کا دوسرا حصہ مسلمانوں کی آمد سے شروع
ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب افغان مغربی سرحدوں سے ہندوستان
میں داخل ہوئے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں ایک شمس ابوالمنصور
کمال عربی کا منشی نگار تھا جو جونپور کے کتب خانے میں بیٹھ کر
ہندوستان کی قدیم تاریخ لکھ رہا تھا اس لیئے اس نے ہندوستان
کے مقدس مقامات کی سیر کی اور لوگوں سے تبادلہ خیال کیا جس
کے نتیجہ میں کبیر جیسے صوفی ہندوستان میں پیدا ہوئے جنھوں نے

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۱۲۹

ہر ہندوستانی کو اپنی تعلیمات سے متاثر کیا۔ اسی دوران کمال کو ایودھیا میں ایک لڑکی چمپا نظر آتی ہے وہ اس سے متاثر ہوتا ہے لیکن جنگ نے دونوں کو جدا کر دیا۔ کمال چمپا کو نہ پا کر کبیر کا بھگت ہو جاتا ہے اور بنگال کا ایک محنت کش کسان بن کر اس سرزمین کو قبول کر لیتا ہے۔

ناول کا تیسرا دور مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اب ناول میں ایودھیا اور پائلی پتر کی جگہ فیض آباد اور لکھنؤ کی تہذیبیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لکھنؤ کی تصویر کشی قرۃ العین حیدر نے بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں بنا رہے تھے۔ نئے نئے کارخانے قائم ہو رہے تھے۔ جوگیوں اور صوفیوں نے جس مشترک تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی اور نوابوں اور راجاؤں نے جسے پروان چڑھایا تھا وہ تہذیب عروج پر تھی۔ بنگال کا گوتم اب اپنی انفرادیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہندوستانی تہذیب کا علمبردار ہے جب لکھنؤ آتا ہے تو چمپا بائی نامی ایک طوائف پر مر مٹتا ہے لیکن گوتم واپس بنگال چلا جاتا ہے اور جب ایک طویل عرصہ بعد لکھنؤ آتا

ہے تو چمپا ایک بھکارن کے روپ میں ملتی ہے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان برٹش ایمپائر میں شامل کر لیا جاتا ہے اور کمال الدین مٹیا برج کے نواب کمن بن جاتے ہیں ۔ گوتم نیلمبر وت پروفیسر نیلمبروت بن جاتا ہے ۔ کمن صاحب کے پاس مافی اور وفعداری تھی اور گوتم کے پاس تعلیم ۔ یہاں تیسرا دور ختم ہو جاتا ہے ۔

ناول کے چوتھے حصہ میں نواب کمن اور پروفیسر نیلمبروت کی اولادیں یو پی کے اونچے طبقہ کے تعلیم یافتہ بن کر ابھرتے ہیں جو ذہین، حساس اور انٹلکچوئل ہیں ساتھ ہی سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں ۔ ان میں گوتم، کمال، ہری شنکر، چمپا احمد، طلعت نرملا، سرل ایشلے اور عامر (بھیا صاحب) خاص ہیں ۔ یہ سب کسی حد تک آئیڈیلسٹ، جذباتی اور اصول پرست ہیں ۔ چمپا احمد کے علاوہ باقی سب قوم پرست ہیں جو ہندوستانی تہذیب اور روایات سے بے پناہ محبت کرتے ہیں یہ سب بیسویں صدی کے باشندے ہیں لیکن ان کے اندر ڈھائی ہزار سال پرانی گوتم اور ابوالمنصور کی روح موجود ہے ۔ اس گروپ کے سارے ہی کردار یادوں کے سہارے جیتے ہیں ۔ یہ سب جذباتی نوجوان یونیورسٹی کے طالب علم ہیں

برطانوی حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ یہ بھارت اور پاکستان پر تبصرہ کرتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لندن چلے جاتے ہیں۔ بھیا صاحب تو لندن سے ہی پاکستان چلے جاتے ہیں۔ لندن میں نرملا دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ چچا احمد کو ہندوستان پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ بھیا صاحب نے اظہار عشق کیا تھا جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ آخر کار لندن سے ڈگری لے کر واپس ہندوستان آجاتی ہے اور اپنے چچا کے یہاں مراد آباد میں رہنے لگتی ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے سبھی لندن سے واپس آجاتے ہیں۔ ہندوستان آتے ہی کمال بہت زیادہ پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے کیوں کہ بھیا صاحب پاکستان چلے گئے تھے اور کوئی ان کے نام ہونے کی وجہ سے کسٹوڈین کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ کمال کو ہندوستان میں تعصب کی بنا پر کوئی اچھی نوکری نہیں ملنے کی وجہ سے وہ بھی مجبوراً پاکستان چلا جاتا ہے جہاں سے وہ طلعت کو ایک طویل خط لکھتا ہے جس میں پاکستان کی سیاست پر تنقید کی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"پاکستان میں نفسا نفسی کا عالم اور حب وطن
کی کمی نظر آتی ہے اس کی وجہ ہے کہ اس سرزمین
سے کوئی بے اختیار جذباتی یا روحانی لگاؤ نہیں
وہ متوقع سیکورٹی کی تلاش میں یہاں آئے
ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہونچی تھیں۔" [1]

"آگ کا دریا" میں ناول نگار نے جہاں ہندوستانی تہذیب کی نمایاں خوبیوں کو پیش نظر رکھا ہے وہیں بدلتی ہوئی تہذیبی قدریں اور بدلتے ہوئے تاریخی حالات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے۔ "آگ کا دریا" کی کہانی ہندوستانی تہذیبی تاریخ کے پس منظر میں اس کے کرداروں کے ذہنی و فکری کیفیتوں اور عمل کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ ناول میں ہر کردار کو اتنا مکمل بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماحول اور تہذیب کی علامت بن گیا ہے۔ ناول میں ادوار بدلتے رہتے ہیں لیکن کرداروں کی شخصی حیثیت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوتی وہ جس دور میں جنم لیتے ہیں اس دور میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ناول کا ہر کردار کئی روپ لیے ہمارے سامنے آتا ہے اور اپنے عہد کی

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۶۹۷

بھرپور ترجمانی کرتا ہے ۔ قرۃ العین حیدر نے خود اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

"چھایا یتھ پر الیسیر ایشٹی ناچ رہی ہیں' مرگسٹ
پر کالی رقصاں ہے' دل کے سنہرے ایوانوں
پر شیو ناچتا ہے اور گوکل میں نٹور گردھاری
کیلاش پر اوما ناچتی ہے' اور یہاں راپتی
کے کنارے مہوٹ کے جھرمٹ میں خزاں
کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے جسے کوئی چھپک
کہتا ہے کوئی چھپارانی' کوئی چھپاوت ۔ اس
کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیوں کہ اس
کے ان گنت روپ ہیں ۔" [1]

اس طرح ناول کے تمام کردار کہانی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھانے میں بھرپور مدد دیتے ہیں ۔

گوتم ویدوں کے عہد کا طالب علم جو حصول تعلیم کے

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص 99

لیے اپنا گھر اور عیش و آرام چھوڑ کر شراوستی آجاتا ہے جنگلوں میں گوتم تا ہے تاکہ روح کا سکون حاصل کر سکے۔ لیکن موریاؤں سے لڑائی میں اس کا ایک ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے تو وہ اداکاری کا پیشہ اپنا لیتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں گوتم کلرک بن جاتا ہے۔ لکھنؤ اور اودھ کی معاشرت سے متاثر ہوتا ہے اور چمپا بائی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کلکتہ واپس جاکر کالج میں داخلہ لے لیتا ہے اور ملازمت ترک کر دیتا ہے۔ پھر راجہ رام موہن رائے کی تقریروں سے متاثر ہو کر برہمو سماج کا جوشیلا کارکن بن جاتا ہے۔ انگریزی دور میں گوتم ایک ایسے ترقی پسند نوجوان کے روپ میں سامنے آتا ہے جو انقلابی خیالات رکھتا ہے۔ وہ ایک صحافی کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بھارت کے سفارت خانہ کا ایک ذمہ دار کارکن بن جاتا ہے اور انگلینڈ، ماسکو اور نیویارک کے چکر لگاتا ہے لیکن جب ان مصروفیات سے فرصت پاکر گھر واپس آتا ہے تو ماضی کے نقوش اس کے دل پر ابھرنے لگتے ہیں۔

ویدک کال کی چمپا کو گوتم سرجو کے کنارے دیکھ کر پسند کرنے لگتا ہے۔ موریاؤں کی لڑائی کے بعد چمپا ایک فوجی افسر

کی بیوی بن جاتی ہے پھر برہمن چمپا ابو المنصور کمال سے محبت کرتی ہے۔
لیکن منصور اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اودھ کے دور حکومت میں
چمپا طوائف کے روپ میں نظر آتی ہے جہاں نواب اور بڑے بڑے
انگریز حاکم اس کے دلدادہ رہتے ہیں۔ اودھ کی تباہی کے بعد ایک
بھکارن کی شکل میں دکھائی دیتی ہے اور آخر میں چمپا احمد بن جاتی ہے۔
لندن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آزاد ہندوستان میں واپس آجاتی
ہے اور مراد آباد میں رشتے کے چچا کے یہاں رہتی ہے۔ زمینداری
ختم ہو جانے کی وجہ سے چچا مفلوک الحال ہو جاتے ہیں۔ جب
کمال پاکستان سے واپس آتا ہے اور چمپا احمد سے ملتا ہے تو اس وقت
اس کی حالت قابل رحم ہوتی ہے لیکن چمپا احمد زندگی سے مایوس نہیں
بلکہ اپنے وطن شیوپوری جانے کی خواہش مند رہتی ہے۔ اس طرح
ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی جد وجہد اور امنگ کو قرۃ العین
نے چمپا احمد کے کردار میں پیش کیا ہے۔ چمپا احمد کو ہندوستان اور
پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کو اپنے وطن سے لگاؤ ہے جو
وفری ہے جہاں وہ کبھی بھی سیاسی حالات میں رہنا چاہتی ہے۔
وہ کمال سے گفتگو کے دوران کہتی ہے

" میں بالآخر بنارس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد
ہے میں نے کیسم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں
تم سے کہا تھا میں واپس جانا چاہتی ہوں کوئی
لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ
کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا کس قدر
زبردست حماقت تھی۔ میں خود بنارس
لوٹتی ہوں۔ جانتے ہو میرے آبائی شہر
کا کیا نام ہے۔
شیوپوری

ہاں مسرت کا شہر — وہ بھی ایک نہ ایک
روز واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا اس
ملک کو دکھ کا گھر یا مسرت کا گھر بنانا میرے
اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا
مطلب ..... اس نے اپنے ہاتھ کھول
کر انہیں غور سے دیکھا۔ رقاصہ کے ہاتھ
آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ نہیں۔ یہ صرف

ایک عام اوسط درجہ کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں
جو اب کام کرنا چاہتی ہے وہ خاموش ہو گئی۔
کچھ دیر کے بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا
بلند ہوئی اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے
سے سر ڈھانپ لیا۔
کمال سے کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔
مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔
تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا وطن ہے
اس نے بے بسی سے انگلیاں موڑیں۔
تم کیوں چلے گئے کیا میں تمہارے یہاں
آجاؤں تو مجھے ایک عہدہ نہ مل جائے
گا۔ دیکھو میں پیرس، سیمرج اور لندن
سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں"۔ [1]

کمال ایک فلسفی ایرانی ماں کی اولاد ہے جو جونپور کے سلطان کے ساتھ مہم پر جاتا ہے لیکن جب سلطان کو شکست ہو جاتی ہے تو

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۵۲۷ - ۵۲۸

یہ صوفیوں کے ساتھ ہو جاتا ہے اور بعد میں گوڑ جا کر سونار گاؤں
کی ایک شودر لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور ہندوستان کو اپنا
وطن بنا لیتا ہے۔ گزر اوقات کے لیے دھان کی کھیتی کرتا ہے اور پھر
بنگال کے قحط میں مر جاتا ہے۔ اس کے بعد نواب کمن بن کر ابھرتا ہے
بعد میں کمال رضا بن کر جدید ذہن اور موجودہ دور کی نمائندگی کرتا ہے۔
اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ہندوستان میں ملازمت نہیں ملتی۔
کسٹوڈین کے جائداد پر قبضہ کے بعد مجبوراً پاکستان چلا جاتا ہے۔ ہجرت
کے اس درد کو قرۃ العین حیدر نے چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے
بہ اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

"تب عدالت نے ایک روز فیصلہ سنایا
"گل فشاں" متروکہ جائداد قرار دے
دی گئی اور دوسرے روز صبح کمال کی
آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں
رفیوجی پایا۔ تیسرے دن پولیس افسر
کوٹھی میں تالہ ڈالنے آ گئے چوتھے روز
کمال نے ویزا منگوایا اور اپنے بوڑھے

والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن
ٹرین دلی پہونچی۔ چھٹے دن ٹرین نے بارڈر کراس
کیا۔ ساتویں دن کمال رضا کراچی میں تھا۔" [1]

شاید طلعت نے اسی دن کے لیے غصہ میں آکر کہا تھا

"وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں
پھینکا جا سکتا۔" [2]

لیکن حالات سے مجبور ہو کر ان سب کو ایسا کرنا پڑا۔ جو کسی بھی طرح
اپنا وطن چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ہجرت کے وقت ان کے دلوں پر کیا
بیتی ہو گی اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس لیے کمال اپنے سفر کے دوران
دیکھتا اور سوچتا رہا۔

"ٹرین کی کھڑکی سے وہ وطن کے لہلہاتے
کھیت دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ میرا
ملک ہے۔ یہ میرا ملک ہے۔" [3]

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۸۲
[2] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۲۶
[3] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۸۶

اس طرح گوتم، کمال، چمپا احمد، ہری شنکر، طلعت اور نرملا کے
کردار ہندوستان کی معاشرت کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں برسوں ساتھ
رہنے کی وجہ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔
بقول راہی معصوم رضا

"قرۃ العین حیدر یہ کمیونکیٹ کرنا چاہتی
ہیں کہ ناموں سے کچھ نہیں ہوتا۔ چمپک
سجاتا اور نند مالا سب ایک ہیں۔ گوتم
نیلمبر ابو المنصور۔ کمال الدین ابو المنصور
نواب کمن۔ گوتم نیلمبر وت۔ کمال رضا
اور گوتم یہ سب ایک ہیں اس لیئے ہزار دن
برس کی یہ کہانی دراصل اس گوتم نیلمبر وت
کی کہانی ہے جو سرجو کو پار کر کے شراوستی
جا رہا تھا اس لیئے کمال رضا کی کہانی کو گوتم
نیلمبر کی کہانی سے الگ کر کے دیکھنا صحیح نہیں
ہے کیوں کہ یوں گوتم نیلمبر ہی کم ہو جائے
گا اس لیئے یہ بات اہم نہیں رہ جاتی ہے کہ

چمپا بائی ہندو ہے یا مسلمان۔

چمپا بائی تو ویشالی کی امبا پالی ہے

چمپا بائی تو ایودھیا کی چمپک ہے اور چمپا

تو ہمارا آپ کا اور ہمارے آپ کے

بزرگوں کا مگھ ہے اور بستیاں ہیں جو

ہندو یا مسلمان نہیں ہوتیں۔ آپ کہہ سکتے

ہیں غم حسینؑ کا ذکر کرنے والی چمپا ہندو

کیسے ہو سکتی ہے آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔" [1]

"آگ کا دریا" کے تمام کردار ہندوستان کی مخصوص تہذیب و تمدن کے ساتھ اپنے عہد کے نوجوانوں کے ذہن و فکری کیفیتوں کی بھی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں ہمیں بیسویں صدی کا وہ ذہن کارفرما نظر آتا ہے جو بیک وقت روشن بھی ہے اور تاریک بھی۔ جس سے قدیم اقدار چھن چکی ہیں اور جو جدید اقدار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ تمام نوجوان کردار حالات کی تبدیلیوں سے گہرے تاثرات قبول کرتے ہیں ترقی پسند خیالات سے متاثر ہوتے ہیں

---

[1] "آگ کا دریا" راہی معصوم رضا اردو ادب علی گڑھ شمارہ ۵ م ۱۹۶۵ ص ۷م - ۸م

عوامی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں بنگال کے قحط کے لیے ریلیف فنڈ
جمع کرتے ہیں اور قیام پاکستان سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔

"کراچی۔ مملکت پاکستان۔ دنیا کی سب سے
بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں
بڑے ملک کا دارالحکومت جہاں کے مسلم
اور پناہ گزینوں کے جو نپٹرے مجاہدات
عالم میں شمار کیے جاتے ہیں خصوصاً وہ
غلیظ ترین بھیانک جھلکیاں جو قائد اعظم
کے مزار کے آس پاس پھیلی ہوئی ہیں۔" [1]

"تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ ہندو کہتا ہے کہ
جب تمہارا کلچر، تمہارے نظریات علیحدہ
ہیں تو جاؤ پاکستان۔ ہمارے سر پر کیوں
سوار ہو۔ چناں چہ یہ قوم مہاجرین بن کر
پاکستان آئی یہاں یہ انکشاف ہوا کہ ہندو سے
تو چھٹکارا مل گیا مگر ایک اور مصیبت کا

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۸۵

سامنا در پیش تھا۔ لاہور میں پنجاب تھا

ڈھاکہ میں بنگالی تھا۔ دونوں جگہ مہاجرین

کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔" [1]

ان اقتباسات سے قرۃ العین حیدر کے احساسات اور درد و کرب کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تقسیم ہند کے واقعات کو قرۃ العین حیدر نے استعاراتی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

"اگست کی بارش اب کے ایسی ٹوٹ کر

برسی کہ زمین آسمان میں ڈوب گئی.....

بارش کا پانی جو شفاف تھا شروع کی

الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی

اس میں خون تھا..... خون کی برکھا

دت خون کی کیچڑ برسانے والے بادل

گومتی ندی جو بہہ رہی تھی (حالانکہ یہ

صرف ڈوبتے ہوئے سورج کا عکس تھا)

پھولوں پر خون تھا انسانوں کی آنکھوں

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۸۶

میں خون اتر آیا تھا" [1]

تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے سامنے بہت سے مسائل درپیش تھے ہندوستان میں زمینداری کا خاتمہ کر کے پنج سالہ منصوبے کے ذریعہ ملک کی ترقی کی جارہی تھی۔ پاکستان کا قیام مذہب کے نام پر ہوا تھا اس لیئے وہاں اسلامی قوانین لاگو کرنے پر زور دیا جارہا تھا۔ ہندوستان کے بارے میں ناول میں اس طرح اظہار کیا گیا ہے

"ہم مذہب کی لائن پر نہیں سوچتے ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ جن کے خیالات کی اہمیت ہے پہلے پنج سالہ منصوبے کے درپے ہیں۔ ہندوستان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ زمینداری کے خاتمہ کے بعد سے آگر دیکھو اس کی حالت کتنی سدھرتی جارہی ہے" [2]

پاکستان میں اسلامی نظام کے نافذ کرنے کی جو کوشش کی جارہی تھی

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۶۶

[2] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۵۱۵

اس پر ناول نگار نے بڑی بے باکی سے تبصرہ کیا ہے۔

"اسلام ــــ اس لفظ کی جو گت بنی ہے کرکٹ
میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام
خطرے میں ہے دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں
آکر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے ..... ہر چیز
پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی
آرٹ، تہذیب، علم و ادب سب کو ملّا کے
نقطہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔" [1]

قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے بعد ہندوستان کے متوسط طبقے کی بدحالی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے

"یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی چمپا
غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔ محلے میں تو
کب کی آچکی ہے جہاں بھوپی اماں کی کوٹھی
تھی۔ وہ چلی گئیں حیدرآباد سندھ مع اپنے
گھر والوں کے۔ لہٰذا کوٹھی کنٹونمنٹ نے لے لی۔

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۶۹۳

اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بلی

منگائی ہے ہمارے مکانوں میں نہیں آسکی۔" [1]

الغرض "آگ کا دریا" روح ہندوستان کا المیہ ہے اور ایک بہت ہی وسیع تاریخی تناظر کے باوجود تقسیم ہند کے بیس منظر میں لکھا گیا ہے۔ گوتم نیلمبر کے بعد ناول کا دوسرا اہم کردار ابوالمنصور کمال الدین ایک مسلمان ہے جو گوتم ہی کی طرح سرزمین ہند پر عہد وسطیٰ سے عہد حاضر تک مختلف ادوار کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا بالآخر بھارت کی سرحد کے پار برصغیر کے اندر ہی ایک نئے ملک میں جا بستا ہے۔ قدیم ہند کے دو علامتی کردار اور عہد وسطیٰ سے ابوالمنصور کمال الدین کے دوست گوتم نیلمبر اور ہری شنکر تقسیم کے بعد ناول کے آخر میں ایک مکالمے کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں تو ناول نگار ان کے زخمی احساس کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

"وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیر حیاں

اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی

کو دیکھتے رہے شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۵۰۷

رہے تھے کہ ابو المنصور کمال الدین کس

طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور

کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔" [1]

"کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا" ان بظاہر سادہ اور جذبات سے عاری الفاظ سے زیادہ پر درد اور پر اثر تبصرہ ہر صغیر میں مسلمانوں کے مقدر اور خود ہر صغیر کی عجیب و غریب تقدیر پر نہیں ہو سکتا۔ ان الفاظ میں بے پناہ تلخی ہے مگر طنز سے زیادہ دردمندی ہے اس لیے کہ جس پس منظر میں یہ الفاظ ادا کیے گئے ہیں وہ گوتم، شنکر اور کمال الدین کی گہری دوستی اور بھائی چارے کا ہے۔ یہ دوستی علامتی طور پر ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کا مظہر ہے اس کے نتیجہ میں صدیوں پر مشتمل ایک شاندار مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی ہے جس کی نقاشی پورے ناول میں کی گئی ہے اور جس کے متوقع انتشار کی طرف ایک المناک اشارہ زیر بحث الفاظ سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ الفاظ اس رومان کے ٹوٹنے کی صدا ہیں جو ہند ایرانی کلچر نے

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۴۸۷

سرزمین ہند پر ترتیب دیا تھا۔ شام اودھ کا جو مصنف کا تہذیبی
مرکز ہے ایک نظارہ دیکھیے۔

"..... ان کرداروں کی اہمیت باہر والے
نہیں سمجھ سکتے ان سب نے مل کر اس دنیا
کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں،
ہندوؤں، مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے یہ
لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں ان
جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی
زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ غریب،
امیر، عورت، مرد جو ٹھاکر امام بخش
اور لالہ حسین بخش، مرزا سندھو اور
نواب کمن کہلاتے ہیں اور امامن مہری
اور مرزا جنگلی اور سکھ بچن لونڈی اور
نواب بسنتی بیگم — یہ سب روتے ہیں
ہنستے ہیں گاتے بجاتے ہیں لڑتے ہیں
شجاعت ان کا شیوہ ہے ان پر جان

دینا، شرافت، احسان مندی، وفاداری
نیکی۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی
جتنی اچھائیاں اور جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں
وہ سب ان میں موجود ہیں اسی لیئے یہ لوگ
بڑے جذباتی ہیں۔ بتاشے اور کوڑی پر ناچنے
والے لقاص، کشمیری بھانڈ، جل ترنگیے
بین کار، باجپئی، برہمن، طبلچی، شاعر،
مرثیہ گو، داستان گو، کائتھ، فوجی،
بانکے، چنڈو بالا، جگت باز، نقال، بہروپے
عالم، فاضل، کلاونت۔ یہاں رزم بزم
ساتھ ساتھ رہتی ہے یہ اصل رومانی معاشرہ
ہے۔" [1]

نقیم ہند نے اس رومانی معاشرہ پر ایک ضرب ضرور لگائی مگر
اسے فنا نہ کر سکی۔ اگرچہ اب اس کے تین رخ ہو گئے یعنی ہندوستان
پاکستان اور بنگلہ دیش۔ بنگلہ دیش کا وجود ناول کی تخلیق کے

---

[1] "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر ص ۲۴۲

بعد ہوا لیکن اس کی مستقل جغرافیائی حیثیت کا احساس بلکہ لغتہ
پہلے سے موجود رہا ہے ۔ شمالی و جنوبی ہند ، مشرقی ہند اور مغربی
ہند کے تین پہلو شروع سے اس سیاسی وحدت میں نمایاں رہے ہیں
جس کی تعمیر مغلیہ سلطنت میں ہوئی اور ترقی برطانوی حکومت
میں ۔ تقسیم کے باوجود اس وحدت پر روشنی ڈالنے کے لیے قرۃ العین
حیدر نے اپنے بعض کرداروں کو انگلستان کی سیر کرائی ہے اور
دکھایا ہے کہ غیر ملک میں کس طرح منقسم برصغیر کے نمائندے حسب
دستور ایک مشترک تہذیب کا منظر اپنی محدود سرگرمیوں میں پیش
کرتے ہیں یہاں تک کہ غیر ملکوں کو یقین نہیں آتا کہ واقعی برصغیر
منقسم ہو چکا ہے ۔ اس کے باوجود سیاسی سرحدوں کی سنگینی اپنی
جگہ ہے جس کی ایک طرف گوتم نیلمبر ہے اور دوسری طرف ابوالمفور
کمال الدین ۔ سرحدوں کے آر پار ایک تہذیب کے دو نمائندوں کا
اس طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑا ہونا ہی وہ زبردست المیہ ہے
جس کی داستان سرائی آگ کا دریا کرتا ہے ۔ اس طرح آگ کا دریا اس
آتشیں خلیج کی علامت بھی ہو سکتا ہے جس کے دو کناروں پر ایک
خاندان کے دو بھائی کھڑے ہیں ۔

# غدّار

کرشن چندر

اس ناول میں ہجرت کے دوران قتل و غارت
گری کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی ابتداء ۲ / اگست ۱۹۴۷ء
سے ہوتی ہے۔ ملک آزاد ہونے والا تھا اور پاکستان کا مطالبہ تسلیم
کر لیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات
شروع ہو گئے تھے لیکن پنجاب کے گاؤں لالہ پور میں فساد کی لہر ابھی
نہیں پہنچی تھی۔ گاؤں میں سب سے زیادہ آبادی برہمنوں کی تھی اور
سب سے کم مسلمان تھے ان میں آپس میں بھائی چارہ تھا۔ ناول کی
ابتداء میں ایک مسلم لڑکی کو ہندو لڑکے سے عشق کرتے ہوئے دکھایا
گیا ہے۔ لڑکی شاداں کہہ رہی تھی

"یوں تو میری شادی بھی ہو جائے گی اور بچے
بھی ہوں گے میرے۔ اور میں ان کے لیے ایک
اچھی ماں، اپنے خاوند کے لیے ایک نیک اور
اطاعت شعار بیوی بھی بن جاؤں گی اور میرا
گھر ہو گا اور زندگی کی ساری خوشیاں جو ایک
عورت چاہتی ہے وہ مجھے نصیب ہوں گی مگر کہیں

پر میرے اندر بہت گہرے اندر اور میری
کوکھ سے بھی بہت دور اندر جہاں کہیں عورت
کی روح رہتی ہے وہاں تم ہمیشہ موجود رہو گے"۔ [1]

ابھی شاداں اور پنڈت میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شاداں کو اپنے بھائی کی آواز سنائی دی۔ شاداں کا بھائی طفیل علی پور شیداں کے پیر قلندر شاہ کے پیغامبر کے ساتھ تھا۔ پیغامبر گاؤں کے نمبردار سربلند کے نام پیغام لے کر آیا تھا کہ پورے علاقے میں فساد شروع ہو گیا ہے صرف آپ کے یہاں ابھی شروعات نہیں ہوئی یہ بہت غلطیات ہے۔ اس خط میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ ۱۵ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو جوان ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے اور جتنی جوان عورتیں آس پاس کے گاؤں سے اکٹھی ہو رہی ہیں انھیں رکھ لیا جائے۔

پورے ملک میں منادات اور منافرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی لیکن لالہ پور کے نمبردار نے سراسر انکار کر دیا کہ ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ جن کے ساتھ ہم صدیوں سے رہتے آئے ہیں ان کو

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص

ہم نہیں مار سکتے۔ علی پور والے مسلسل دھمکی دے رہے تھے کہ لال پور کے مسلمانوں نے ہندوؤں کا صفایا نہ کیا تو ہم لوگ خود آکر ان لوگوں کو مار ڈالیں گے۔ پنڈت نے گھر جاکر جب یہ خبر سنائی تو محلاں میں جہاں آس پاس کے برہمن اور کھتریوں کے خاندان پناہ لینے آرہے تھے کہرام مچ گیا۔ لوگوں کی پریشانی کو دیکھ کر نمبردار محلاں آیا اور سب کو اطمینان دلایا کہ ہم لوگوں کے رہتے ہوئے علی پور والے آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ بستی کے سارے مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم علی پور والوں کا مقابلہ کریں گے۔ ان باتوں سے وقتی طور پر تو گاؤں کے لوگ مطمئن ہو گئے لیکن تین دن بعد ہی علی پور والوں نے حملہ کر دیا۔

محلاں میں کہرام مچ گیا گاؤں کے نمبردار نے کہہ دیا کہ ہم پچاس آدمی پانچ سو کا مقابلہ نہیں کر سکتے لہذا اپنی جان و مال کی حفاظت خود ہی کرنی پڑے گی۔ نمبردار کا جواب سنتے ہی ہر کوئی اپنی جان بچا کر بھاگنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں خالی ہو گیا۔ صرف پچاسی برس کی بوڑھی عورت پنڈت کی نانی گھر میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی پنڈت اسے ساتھ لے جانے پر بضد تھا لیکن وہ تیار نہ

ہولی آخر پنڈت اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے اسے شاداں کی یاد ستانے لگی۔ شاداں بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اسٹیشن پہنچ کر شاداں نے پنڈت کو اپنے بھائی کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔ پنڈت اپنا مذہب تبدیل کرنے تیار ہو گیا تھا لیکن شاداں اس کی جان کی حفاظت کے لیے اسے لاہور بھیج رہی تھی۔ طفیل کے ساتھ پنڈت لاہور پہنچ گیا۔ لاہور پہنچنے پر طفیل نے کہا کہ اگر شاداں نے قسم نہ لی ہوتی تو میں تجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ اسٹیشن سے وہ اپنے گھر پہنچا۔ گھر سے سب لوگ جا چکے تھے گھر کا قیمتی سامان غائب تھا۔ ایک دن ایک رات گھر میں رہا۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہو گئی تو بازار گیا کباب والے نے پہچان کر بھاگ جانے کا مشورہ دیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ تمہارے دوست حاجی اور ببرک، تاجی کے یہاں گانا سن رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر اسے اطمینان ہوا اور وہ تاجی کے کوٹھے پر چلا گیا۔ دوستوں نے اسے لہنہ قبا قلی پہنایا اور میاں اسے اپنے گھر لے آیا۔ حاجی بھی اس کے ساتھ گھر آیا۔ دیر رات گئے حاجی نے گھر سے باہر جا کر منادیوں کو میاں کے گھر بھیج دیا کہ میاں نے ایک ہندو کو پناہ دی ہے۔ غنڈوں نے

میاں کے دونوں بچوں کو یرغمال بنالیا۔ میاں کی بیوی پریشان تھی کہ جب تک پنڈت کو غنڈوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا بچے واپس نہیں ملیں گے۔ وہ میاں سے لڑ رہی تھی۔

"تمہیں کوئی حق نہیں ہے اسے یہاں رکھنے کا۔
میں کچھ نہیں جانتی تم اسے غنڈوں کے حوالے
کردو۔ تم نے اسے غنڈوں کے حوالے نہ کیا
تو میں تمہارا، اس کا دونوں کا خون پی جاؤنگی"۔ [1]

میاں نے رات بھر پنڈت کی حفاظت کی اور صبح اسے ریلوے اسٹیشن پہنچادیا۔ وہ چلاتا رہا میں لاہور میں رہوں گا لاہور میرا وطن ہے لیکن اسے اپنے وطن میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا اس کی موت کو دعوت دے سکتا تھا۔ اس کے دوست نے اسے ٹکٹ تھماکر کہا کہ تم یہاں سے بہ حفاظت جاسکتے ہو۔

پنڈت بہ حفاظت اپنے آبائی وطن کوٹلی سودگاں تحصیل شکرگڑھ ضلع گرداس پور پہنچ گیا۔ وہاں اس کے بھائی، بہن اور پورا خاندان موجود تھا یہاں ابھی امن تھا لیکن کسی بھی وقت فساد

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص ۲۷

ہونے کا خدشہ تھا۔ پنڈت کے دادا کو گمان بھی نہ تھا کہ ان پر
بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ گھر کے بعض افراد کا خیال تھا کہ گھر چھوڑ کر کسی
محفوظ جگہ چلے جانا چاہیئے۔ لیکن کچھ افراد کی رائے میں اس کی کوئی
ضرورت نہیں تھی۔ ابھی یہ لوگ متفقہ طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پائے
تھے کہ انھیں کے مزارعوں نے حملہ کر دیا۔ کئی لوگ مارے گئے۔ پنڈت
کھیت میں چھپ گیا امن ہونے پر وہاں سے بھاگا اس کے ساتھ صرف
ایک کتیا تھا جس نے آخر دم تک اس کا ساتھ دیا۔

یہ علاقہ اب پاکستان کا تھا۔ پاس ہی راوی ندی تھی
جو ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کو منقسم کرتی تھی۔ پنڈت
ہندوستان کی سرحد کی طرف آ رہا تھا راستے میں مسلح مسلم منادی ملے
جب ہندوؤں کا قافلہ ان کے قریب پہنچا تو منادیوں نے ان پر
حملہ کر دیا۔ آدھے گھنٹے میں ہزاروں انسان کاٹ کر پھینک دیئے
گئے۔ پنڈت نے تیر کر دریا کو پار کیا اور ہندوستان پہنچ گیا۔
راستے میں اسے طرح طرح کے لوگ ملے۔ پنڈت ان دردناک
واقعات کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا اور اس کے دل میں مسلمانوں
کے لیئے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس کی بیوی مل گئی لیکن اس کا بیٹا

مناسار دیا گیا اور اس کی بہن سروج کو مسلمان اٹھالے گئے تھے۔ ان سب واقعات کے پیش نظر اس کے دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ہندو فسادیوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ ہندو فسادیوں کا گروہ بھی مسلمان فسادیوں سے کم نہیں تھا۔ یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں سے پاکستان جانے والے قافلوں پر اسی طرح مظالم ڈھا رہے تھے جیسا کہ سرحد پار ہندو قافلوں پر مسلمان فسادی کر رہے تھے۔ ہندوستانی سرحد پر جیسے ہی کسی مسلم قافلے کی خبر ملتی ہندو، سکھ دونوں اس کو لوٹنے کا منصوبہ بنانے لگتے۔ راوی کا پل دو گھنٹے ہندوؤں کے لیے اور دو گھنٹے مسلمان قافلے کے گزرنے کے لیے کھولا جاتا تھا۔ لیکن قافلہ اتنا بڑا ہوتا کہ دو گھنٹے میں قافلے کے سارے لوگ پل پار نہیں کر سکتے بچے ہوئے لوگوں کو لوٹنا بہت آسان تھا۔ جب ہندوؤں کا قافلہ آتا تو وہ شرنارتھیوں کے ساتھ ہو گیا اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کس کے ساتھ چل رہا ہے۔ جو حالت مسلم قافلوں کی تھی وہی حالت ہندوؤں کی بھی تھی۔ جب مخالف سمت سے کوئی قافلہ آتا تو شرنارتھیوں کی حالت دیکھ کر ہندو اور سکھ مشتعل ہو کر مسلم قافلوں پر لوٹ پڑتے چناں چہ تھوڑی ہی دیر میں

ڈکی کا میدان لاشوں سے بھر گیا۔ پنڈت بھی حملہ آوروں میں شامل تھا اس نے ایک بوڑھے پر حملہ کیا تو وہ چلّا اٹھا "نہ بیٹا مجھے نہ مار" لیکن پیچھے آ رہے منادیوں نے اس بوڑھے کا خاتمہ کر دیا اور اس کا بیٹا کھڈ میں گر گیا۔ پنڈت رات میں اس کے متعلق سوچتا رہا اور آخر میں فیصلہ کیا کہ اس لڑکے کو دیکھنا چاہیئے۔ ڈکی کے میدان سے وہ لڑکے کو اٹھا لایا۔ لیکن اسے کہاں لے جاتا۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا جب انسان اپنی وحشی جبلتوں پر قابو پا کر انسانیت کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ ابھی تو اس بچے کو اپنا لینا ملک، قوم اور مذہب کے ساتھ غداری تھی۔

ناول کا مرکزی کردار پنڈت بیج ناتھ فسادات کے دوران ہندوستانی علاقے میں بھی رہتا ہے اور پاکستانی علاقے میں بھی جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنے ناہنجال لالے گاؤں سے لاہور جاتا ہے وہاں سے آبائی وطن گرداس پور کے ایک گاؤں آتا ہے وہ بھی پاکستان میں تھا۔ پھر وہاں سے جان بچا کر ہندوستان آتا ہے اس طرح اس کا تعلق دونوں علاقوں اور دونوں قوموں سے ہوتا ہے۔ اس نے مختلف جگہوں پر تقسیم سے پیدا شدہ فسادات

کا اظہار کیا اپنے مسلمان دوستوں سے ملا - ان کے ردعمل کو سمجھا اور بیان کر دیا - دراصل پنڈت کے کردار میں کرشن چندر کا اپنا کردار نمایاں ہے -

ہر انسان چاہے وہ کسی ملک اور قوم سے تعلق رکھتا ہو اسے اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے اسے وہ آسانی سے نہیں بھول سکتا - پنڈت کے گھر والے بھی اپنے وطن میں ہی رہنا چاہتے ہیں چاہے ان کا گھر پاکستان میں ہو یا ہندوستان میں -

"کیا بات کرتے ہو بیج ناتھ اگر اس دھرتی پر
پاکستان بنے گا تو کیا ہوا ہم اسی دھرتی پر رہیں
گے اور اسی کا جس گائیں گے جیسا سات پیڑھیوں
سے کرتے چلے آ رہے ہیں" [1]

لیکن انگریزوں نے جو ہندو مسلم نفاق بہت پہلے پیدا کر دیا تھا وہ رفتہ رفتہ اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا تھا - بہت سے ایسے لوگ تھے جو نئے ملک جانے کے خواہاں تھے انھیں اپنے وطن سے محبت تھی لیکن نئے ملک سے انھیں بہت ساری امیدیں بھی تھیں - ان ہجرت کرنے

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص ۱۱

والوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو صرف اپنی محبت کی خاطر نئے ملک جا رہے تھے۔ پاروتی بھی اس قافلے میں شامل ہو کر جا رہی تھی جو پاکستان جا رہا تھا۔ پاروتی ایک مسلم لڑکے سے محبت کرتی تھی جس کو اس کے باپ نے مار ڈالا اس لڑکے کے لوگ پاکستان چلے گئے تھے پاروتی بھی اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان جا رہی تھی اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس کے گھر والے اسے تسلیم کریں گے یا نہیں وہ ایک بیوہ بنی جا رہی تھی۔

فسادات کے وقت جو انسانیت سوز شرم ناک واقعات ہوئے اسے کرشن چندر نے اپنے ناول میں بڑی جرات سے پیش کیا ہے۔ ایک ہی گاؤں کے لوگ آپس میں مار کاٹ کر رہے تھے جن کو کل تک بہن بیٹیاں سمجھتے تھے انھیں کی عزت لوٹ رہے تھے۔ ایک جگہ بھیڑ لگی دیکھ کر پنڈت پوچھتا ہے کیا یہاں راشن بٹتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے

"ہاں میاں سیکس کا راشن ملتا ہے.....

ایک مسلم لڑکی ہتھے چڑھی ہے ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ لائن میں پچیس آدمی

تھے پنڈت بھی اس کیو میں شامل ہو گیا
اور اگلے آدمی سے پوچھا "یہ کیو کب تک
رہے گا" "جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی"۔
..... اس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں" [1]

انسان کے مقابلے میں حیوان جو بالکل ناسمجھ ہوتے ہیں ان میں بھی ایسی درندگی اور وحشیانہ پن نہیں ہوتا۔ ناول میں کرشن چندر نے انسان کو کتے سے بھی زیادہ حقیر دکھایا ہے۔

"جب سب ساتھ چھوڑ گئے، جب ملک
نے ساتھ چھوڑ دیا اور زمین نے، گلی نے
اور خاندان نے، گھر والوں نے، دوست
احباب نے، جب اس دھرتی نے اپنا ساتھ
چھوڑ دیا جس کے ساتھ ہزاروں برس سے
ہم نے محبت کا عہد و پیمان باندھا تھا تو کیا
تیری ایسی حقیر کتیا ہی نے میرا ساتھ دینا تھا؟" [2]

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص ۸۶

[2] "غدار" کرشن چندر ص ۸۵

روی کتیا نے اپنے مالک کے ساتھ راوی ندی میں تیرنا شروع کیا
لیکن پنڈت کا ساتھ نہ دے سکی اور دم توڑ دی۔

"روی مر گئی اور اس کے ساتھ ایک عہد مر گیا۔
ایک تہذیب مر گئی۔ ایک داستان مٹ گئی
تاریخ کا ایک ورق الٹ گیا" [1]

اس سے ناول نگار نے تہذیب کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے کہ
انسان کے اتنی ترقی کرنے کے باوجود اس کی تہذیب ابھی نامکمل ہے۔
وہ صرف اپنی تہذیب کے روشن پہلو کو دیکھتا ہے لیکن اس کے بے پناہ
تاریک پہلو بھی ہیں جنھیں کوئی بیان نہیں کرتا۔ جو اس تہذیب کی نکتہ
چینی کرتا ہے وہ اپنی تہذیب میں غدار کہلاتا ہے۔

"یہ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب،
عیسائی تہذیب اور سکھ تہذیب،
یورپی تہذیب اور ایشیائی تہذیب،
ان چمکتی ہوئی تہذیبوں کے اندر کتنی
گہری کھائیاں، کیسی کیسی خوف ناک

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص ۸۱

تاریکیاں مستور ہیں۔ لیکن وہ بتاتے
ہیں ہیں اور جو کچھ بتاتے ہیں وہ بہت
ہی خوبصورت، پر شکوہ اور شاندار
ہوتا ہے اور اگر کوئی جرات کرکے اس
تہذیب کی خوشنما قبا کو ہٹا کے دیکھنا
چاہے تو اسے غدار سمجھ کر قتل
کر دیا جاتا ہے اس کی پیٹھ میں بلّم
بھونک دیا جاتا ہے" [1]

انسانی تہذیب پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو گیا لیکن اس کے برعکس پنڈت کی کسیا کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

"تو انسان تھوڑی ہے کہ تجھے اپنی جان کا ڈر ہو۔ یہ سب تو تہذیب کی باتیں ہیں، اونچے مذہب اور اخلاق کے جھگڑے ہیں۔ یہ تلوار تو بہت بلند اصولوں کی

---

[1] "غدار" کرشن چندر ص ۱۱۵

حمایت میں نکلی ہے، شکر ہے کہ تیرا گلا

اس سے نہ کاٹا جائے گا۔ شکر کر تو غیر

مہذب ہے جاہل اور بے اخلاق ہے۔ شکر

کر کہ تجھے یہ تک معلوم نہیں کہ مذہب کیا

ہے۔ تو نے کبھی سندھیا نہیں کی۔ کبھی پانچ

وقت نماز نہیں پڑھی، تو کبھی کسی گرجے

مندر، مسجد نہیں گئی۔ تو نے کبھی آزادی کا

مفہوم نہیں سمجھا۔ کبھی کسی سیاسی لیڈر کی

تقریر نہیں سنی۔ شکر کر کہ تو کیا ہے

انسان نہیں ہے۔" [1]

اس طرح کرشن چندر نے تقسیم ہند کے موقع پر برپا ہوئے

فسادات پر قلم اٹھا کر انسانی تہذیب کو نامکمل اور ناپختہ ثابت

کر دیا ہے۔

# چاند گہن

## تذکرہ بستی

انتظار حسین

اس ناول میں انتظار حسین نے تقسیم ہند کے
فسادات اور ہجرت کرنے والوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول
کا پلاٹ سبطین اور فیاض خاں کے گرد گھومتا ہے۔ سبطین اور فیاض
خاں دونوں کالج کے زمانے سے دوست تھے رفتہ رفتہ ان کی دوستی
بڑھتی گئی۔ ان کا ذکر ناول میں اس طرح کیا گیا ہے۔

"..... اس مرتبہ ان پر کیا یک قومی اصلاح
کا بھوت سوار ہوا یہ وہ موڑ تھا جہاں سے ان
کے رستے قدرے الگ الگ ہوئے ورنہ اب
تک تو وہ قدم سے قدم ملائے اس طرح چل
رہے تھے کہ ان کی چالوں میں فرق کرنا مشکل تو
کیا ناممکن تھا۔ دونوں عالم فاضل دونوں
جنونی۔ لیکن اب دونوں کی حیثیتوں کا فرق
واضح ہونے لگا۔ سبطین تو خرد کی گتھیاں سلجھاتا
رہ گیا لیکن فیاض خاں نے ترقی کر کے ایک مجذوب

کی حیثیت اختیار کرلی - تھوڑے دن تک
اس نے بھی سبطین کے ساتھ ساتھ قوم کے زوال
کے اسباب پر غور کیا تھا لیکن بہت جلد وہ مرد
مجاہد بن کر میدان عمل میں اتر آیا - یوں عمل کے
میدان میں سبطین بھی بعد کو آ گیا لیکن اس کی
حیثیت پھر بھی ایک مفکر ہی کی رہی مرد مجاہد
وہ کبھی نہ بن سکا۔" [1]

سبطین حسن پور کا رہنے والا تھا اور فیاض خاں پشاور کا - فیاض
خاں نے باپ کی زبردستی سے آئی - سی - ایس کا امتحان پاس کر لیا
اور سب سے پہلے اس کا تقرر کلکٹر کی حیثیت سے لکھنؤ میں ہوا لیکن
اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ وہاں کے لوگوں سے
کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی - فیاض خاں کے سر میں اپنے
زمانے کے سرسید بننے کا سودا سمایا ہوا تھا اس کی خاطر وہ شہر
شہر گھوما - حسن پور سے کلکتہ - کلکتہ سے جنوبی ہند - جنوبی ہند
سے لاہور اور لاہور سے علی گڈھ - علی گڈھ سے دلی - لیکن اس

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۲۰

کی اصلاحی اور انقلابی تحریک نہ چل سکی ۔ سبطین پروفیسر بن گیا
اس نے عوام تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے ایک اردو اخبار "انقلاب"
نکالا لیکن وہ چل نہ سکا بالآخر اسے بند کرنا پڑا ۔ اس کی بیٹھک میں
مختلف قسم کے لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا تھا جن میں پرانے طالب علم
وکیل ، نمبردار سبھی شامل تھے ان سب میں موجودہ سیاسی حالات پر
مباحثے بھی ہوتے تھے ۔

تقسیم ملک کے ساتھ ہی فسادات شروع ہو گئے
لوگ جوق در جوق پاکستان ہجرت کر رہے تھے ایسے وقت میں
فیاض خاں دہلی جانے کی تیاری کر رہا تھا سبطین نے اسے پاکستان
جانے کی رائے دی جس پر فیاض خاں کہتا ہے

"علی گڈھ سے بہت سے تالے والے اور کچھ
پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر اور چالاک قسم کے
پاکستان گئے ہیں چلتے وقت ان میں سے ہر
شخص نے یہی اعلان کیا تھا کہ ہم پاکستان کی
تعمیر کرنے جا رہے ہیں پاکستان ان کا استقبال
کرے گا ہمارا تمہارا استقبال نہیں کرے گا ۔ پاکستان

کو اناڑی قفل سازوں، پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹروں
اور چالاک تعاویذ اوروں کی ضرورت ہے ہماری تمہاری
ضرورت نہیں ہے۔" [1]

ناول میں عورتوں کی توہمات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سبطین کی والدہ بوجی نے خواب میں چاند گہن دیکھا جاگنے کے بعد انھوں نے اس کی وجہ یہ تلاش کر لی کہ ان کی جوتیاں سرہانے پڑی رہ گئیں تھیں جس کے سبب کہ راؤ نے خواب آنا ضروری ہیں۔ لیکن اس معقول توجیہہ کے بعد بھی وسوسوں نے بوجی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بار بار انھیں اپنی اماں جی کی یہ روایت یاد آتی تھی کہ ۵۷ء سے پہلے ایسا چاند گہن پڑا تھا کہ پورا چاند گہنا گیا تھا اس روایت کے خیال کے ساتھ ہی انھوں نے نماز سے فارغ ہو کر تعبیر نامہ نکالا اور گہن دیکھنے کی تعبیر غور سے پڑھی جس میں لکھا تھا

"کال پڑے یا بادشاہ پر آفت آئے۔ رعایا پریشان ہو۔ جان و مال کا نقصان ہو۔ چاہیے کہ خواب کسی سے نہ کہے رفع بلیات کی خاطر

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۹۱۶

صدقہ دے[1]

بوبی نے فوراً اپنی ملازمہ گلشن کو پانچ روپے دے کر غربا میں کپڑے تقسیم کروائے۔ نکڑ شاہ کے مزار پر چڑھانے کے لیے پیڑے بھجوائے لیکن اس سے بھی ان کی تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے گلشن سے کہا "مولوی صاحب کے پاس تو جائیو کہنا کہ ہمارے گھر کو کیل دو"۔ اس سے یو۔پی کے متوسط گھرانوں کی توہم پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

ناول میں فسادات کی فضا کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کی آگ نے دلی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ناول میں فیاض خاں کی ڈائری کے ذریعہ فسادات کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"فساد شروع ہوا اور آگ کی طرح
پھیل گیا۔ ہر محلہ پر یورش ہے اور
ہر بستی پر حملہ کی تیاریاں ہیں۔ رات
ایسا شور ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یہ خوفناک

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۵۳

شور خود آدمی کو پاگل کر دینے کو بہت کافی
تھا۔ فائر انجنوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی
رات بھر آتی رہیں ان آوازوں کو سن کر
یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری دلی شعلوں
میں جھونک دی گئی ہے ..... یہ کوئی
معمولی فساد نہیں ہے یہ کوئی بڑی قیامت
ہے ۵۷ء کی قیامت سے بڑی قیامت"۔ [1]

"... پرانے قلعہ میں پناہ گزینوں کا
تانتا لگا ہوا ہے محلے اجڑ رہے ہیں اور لوگ
یہاں آ رہے ہیں مختلف محلوں سے لوگ سمٹ
کر پرانے قلعے میں آتے ہیں پرانے قلعے سے
اسٹیشن پہنچتے ہیں اسپیشل بھرتی ہے اور
پاکستان روانہ ہو جاتی ہے گاڑیوں پر حملوں
کی خبریں روز پہنچتی ہیں اور پھر بھی لوگوں کا
ذوق و شوق کم نہیں ہوتا۔ دلی والے دلی

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۹۳-۹۴

میں ڈر کر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے بیل رسّہ تڑا
کر بھاگتا ہے..... بالآخر رخصت کی
گھڑی آپہنچی۔ اس عجیب و غریب شہر سے آج
میں رخصت ہو رہا ہوں۔ یہاں میں آیا بھی
عجب انداز سے اور جا بھی رہا ہوں عجب انداز
سے۔ میں نے مسلمانوں کے بہت سے شہر دیکھے بہت
سی بستیوں کی سیر کی مگر اس بستی کا سفر
سب سے انوکھا رہا اس شہر کے در و دیوار
جن سے کل تک وحشت برستی تھی آج چپ چاپ
حسرت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ یہ لال قلعہ،
یہ قطب مینار، یہ جامع مسجد یہ مسلمانوں کی
تاریخ کے گنگ نغمے۔ یہ پرسوز مسجد مرثیے
چند گھنٹوں کے اندر اندر میری نگاہوں سے
اوجھل ہو جائیں گے یہ پوری بستی نگاہوں سے
چھپ جائے گی تاریکی میں ڈوب جائے گی اور
میں اپنے نئے وطن کی طرف جا رہا ہوں گا۔"[1]

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۱۰۱

حسن پور ابھی تک فسادات کی چنگاریوں سے محفوظ تھا لیکن
مغربی پنجاب سے آنے والے شرنارتھی اپنے ساتھ نفرت کا
جذبہ اور انتقام کا جوش بھی لائے یہ دونوں چیزیں حسن پور کی
ساری فضا پر چھا گئیں۔ بالآخر بوبی اور سبطین کو بھی حسن پور
سے ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑا۔ راستے میں انھیں کئی قافلے ملے۔

"خاک آلود چہرے، خوف سے لرزتے ہوئے
جسم، وحشت آلود آنکھیں، ان کے سروں کے
بڑے بڑے پگڑ اور چوڑے چکلے لٹھ اور قد آور
جسم بتا رہے تھے کہ یہ لوگ بھی فرد بہادر ہوں
گے انھوں نے نہ معلوم کیسے کیسے معرکے مارے
ہوں گے اور کیسے کیسے سورماؤں سے ٹکر لی ہوگی
مگر وقت کی ایک جنبش نے انھیں بزدل بنا دیا
تھا اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی زمینوں کو
اپنے آبائی بستیوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے
جیسے بھونچال میں لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر
بھاگتے ہیں۔ بھونچال واقعی آیا تھا۔ بھونچال

خون برساتا اور انگارے اُگلتا آیا تھا اور
لوگ اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں کو اپنی
جمع جتھ اور اپنے ساز و سامان کو اپنی آبرو
کی اپنی آن کو غرض سب کچھ چھوڑ کر بھاگ
نکلے تھے۔" [1]

لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد بھی ان مہاجرین کے مسائل ختم نہیں ہوئے پاکستان نے انھیں مرنے سے تو بچا لیا لیکن زندگی گزارنے کے لیے وسائل فراہم نہ کر سکا۔ پاکستان پہنچنے کے بعد فیاض خاں نے جب ایک بوڑھے کباب فروش سے پوچھا

"کہو بڑے میاں فساد کے دنوں میں آئے تھے؟

"ہاں میاں" کباب فروش متاسفانہ لہجہ میں بولا

ساری دلّی میں آگ لگ رہی تھی اپنی بھری دکان
چھوڑ کے آیا ہوں۔ سامنے سیخیں رکھی تھیں بس
انھیں بغل میں مارا اور نکل پڑا۔ پھر آپ ہی کہنے لگا
میاں بہت بڑی دکان تھی میری یہاں کیا ہے سڑک

---

[1] "چاندگہن" انتظار حسین ص ۱۲۲

پر سیٹھا ہوں"۔ [1]

"چاند گہن" میں انتظار حسین نے موثر انداز سے اس قیامت کا ذکر کیا ہے جو تقسیم ہند کے وقت ہندوستانیوں پر آپڑی تھی اور فسادات کے بعد مہاجرین کی مصیبتوں کا بیان ایسے دلدوز انداز میں کیا ہے کہ ناول کی پوری فضاء پر ایک خاص قسم کا حزن طاری رہتا ہے۔

"تذکرہ" انتظار حسین کا دوسرا ناول ہے۔ اس میں انھوں نے ہجرت کے بعد مہاجرین کی ان پریشانیوں کو پیش کیا ہے جو انھیں رہائش کے لیے درپیش تھیں۔

"تذکرہ" میں بار بار دو معاشرے سامنے آتے ہیں تقسیم سے پہلے کا زرعی چھوٹے چھوٹے قصبوں اور شہروں کا معاشرہ اور تقسیم کے بعد بڑے شہروں کے انبوہ کا معاشرہ جہاں فرد اپنی شناخت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار افلاق ہے جو ملک کی تقسیم کے وقت سے اپنے آباواجداد کی پر رونق حویلی "چراغ حویلی" چھوڑ

---

[1] "چاند گہن" انتظار حسین ص ۱۲۵

کر آیا ہے۔ لاہور میں مناسب مکان کے لیئے سرگرداں ہے۔ اسے شہر
سے دور ایک پر سکون مقام پر کوٹھی کا ایک حصہ مل جاتا ہے وہ جگہ
اخلاق کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے۔ فطرت کا حسن مولسری
اور پیپل کے درخت، پرندوں کی چہچہائیں اسے گرویدہ کر لیتی ہیں
اس نئی زندگی سے ابھی یہ لوگ مفاہمت کرتے ہیں کہ ایک تجارتی قسم
کا آدمی پوری کوٹھی اپنے نام الاٹ کرا لیتا ہے۔ وہ اخلاق سے
کہتا ہے کہ اب یہاں رہائشی مکانات اور دکانات بنیں گے۔
اگرچہ وہ اخلاق سے کوٹھی خالی کرنے کے لیئے نہیں کہتا مگر اخلاق
کے لیئے یہ تو وہی لمحہ فرسا ہے کہ مولسری اور پیپل کے درخت
کاٹ دیئے جائیں گے۔ اخلاق کوٹھی چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد
وہ کئی جگہ کرائے کے مکانوں میں رہتا ہے کافی پریشانیاں اٹھانے
کے بعد بالآخر اپنے دفتر کے ساتھیوں کی طرح وہ بھی اپنا مکان بنانے
کے چکر میں پلاٹ کے لیئے عرضی دیتا ہے۔ بارہ مرلے کا پلاٹ اسے
الاٹ ہو جاتا ہے وہ قرض لے کر کسی نہ کسی طرح اپنا مکان بنوا لیتا
ہے۔ ایک روز یہ اعلان ہوتا ہے کہ جیل کے عقبی حصے میں تین
آدمیوں کو پھانسی دی جائے گی۔ سارے شہر میں ہلچل مچ جاتی

ہے اس وقت اخلاق اور اس کے افراد خاندان کو پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ پھانسی کی جگہ ان کے گھر سے قریب ہے اور گھر کے عقبی حصے سے صاف نظر آتی ہے۔ ایک روز اخلاق کی بیوی گھر کے پچھواڑے کی طرف جاتی ہے تو اس کی نظر اس جگہ پر پڑتی ہے جہاں پھانسی لگائی گئی تھی۔ اسے تین کفن پوش نظر آتے ہیں وہ ڈر جاتی ہے اور شوہر سے مکان بیچ دینے پر اصرار کرتی ہے۔ بوجان مخالفت کرتی ہیں مگر اگلے ہی روز پراپرٹی ڈیلر آجاتا ہے اخلاق کے انکار کے باوجود وہ پیچھے پڑ جاتا ہے اور گاہکوں کو لے کر آتا ہے۔

اخلاق کے ذہن پر جو بے یقینی کی کیفیت طاری ہے وہ پورے ناول کی فضاء پر چھائی ہوئی ہے۔ ایک شخص جو اپنے جمے جمائے مکان سے ایک ایسے معاشرے میں آیا ہے جہاں ہر شئے ابھی سیال کیفیت میں ہے۔ رشتے، ناطے، دوستی، لین دین کسی کی سطح ابھی متعین نہیں ہے۔ مختلف مقامات سے لوگ آکر جمع ہوئے ہیں۔ ان کے رسم و رواج مختلف، عادتیں جداگانہ، رہن سہن کا انداز الگ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ اخلاق کے ذہن میں

پرانی روائتیں ہیں۔ چراغ حویلی کی تہذیب، بزرگوں کے تذکرے اور کاغذات جنھیں وہ سنبھال کر رکھتا ہے۔ دوسری طرف دولت کی افراط اور اسباب پرستی اپنے عروج پر ہے۔ ان حالات میں گھر کا کوئی مفہوم ہی نہیں سوائے سر چھپانے کی ایک جگہ کے۔ جب اخلاق کے نام پلاٹ لکھا جاتا ہے تو اخلاق کی ماں بوجان اس سے پوچھتی ہیں

"بیٹے دیکھ بھی لیا ہے کہ زمین کیسی ہے؟"

"بوجان اچھی زمین ہے۔"

"پہلے استخارہ کرلیا ہوتا زمین استخارے کے بغیر نہیں لینی چاہیئے۔"

"استخارہ؟ اگر استخارہ منع آجاتا تو پھر میں تو پلاٹ سے گیا تھا۔"

"میرے لال۔ بوجان نے سمجھاتے ہوئے کہا زمین کا ساتھ عمر بھر کا ہوتا ہے خریدنے سے پہلے بہت سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔"

میں دل میں ہنسا۔ بوجان اپنے زمانے کے حساب

سے سوچ رہی تھیں۔ جو زمانہ انھوں نے دیکھا
برتا تھا اس میں بے شک یہی طور تھا۔ آدمی مکان
زندگی میں ایک مرتبہ بناتا تھا جہاں جس زمین پہ
بنا لیا سو بنا لیا پھر وہ پشتوں تک چلتا تھا...
.... اب تو عقلمندوں نے یہ طور پکڑا ہے
کہ ہر نئی ہاؤزنگ اسکیم کے شروع ہونے پر
پلاٹ کے لیے عرضی داغ دی۔ پلاٹ ملنے پر
مکان بھی بنا لیا تو بھی لازم نہیں کہ اس میں
پوری عمر گزار دیں۔ نئے زمانے کے تعمیر
کرنے والے جس شوق سے مکان تعمیر کرتے ہیں
اسی شوق سے منافع ملنے کی صورت میں اسے
فروخت کر ڈالتے ہیں۔" [1]

مگر کسی بھی تہذیب کا بنیادی نشان ہوتا ہے لیکن جب ذہنی رویوں ہی میں تبدیلی آجائے تو تہذیب کا مٹنا لازمی امر ہے۔ پورا ناول اسی تہذیب کے اطراف گھومتا ہے۔

---

[1] "تذکرہ" انتظار حسین ص ۳۴-۳۵

انتظار حسین کا ناول "بستی" گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ "بستی" کا آغاز تقسیم کے کئی برسوں بعد اس وقت ہوتا ہے جب پاکستان اپنے ابتدائی پر سکون دور سے گزر کر سیاسی ہنگاموں اور معاشرتی افراتفری کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔

ناول کے پہلے باب میں انتظار حسین نے روپ نگر اور ناول کے مرکزی کردار ذاکر کے بچپن کو متعارف کرایا ہے۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات ذاکر نامی ایک نوعمر کھلنڈرے لیکن متجسس ذہن رکھنے والے لڑکے سے ہوتی ہے جس کے لیے پورا روپ نگر ایک پر اسرار لیکن مسرت اور معلومیت سے بھرپور ذہنی اور فکری تجربہ ہے۔ ذاکر اپنے ابا جان کی قرآن و حدیث کے حوالے سے اور گاؤں کے بھگت جی کے ہندو اساطیر کے حوالے سے کی گئی باتوں سے یکساں متاثر اور مرعوب ہوتا ہے۔ ذاکر کے خالو جان کی اچانک موت کے سبب اس کی خالہ بتول کا عدم اپنی دونوں لڑکیوں طاہرہ اور صابرہ کے روپ نگر آجانا نہ صرف ذاکر کی زندگی بلکہ پورے ناول کا ایک بے حد اہم موڑ ہے۔

جب ذاکر اور اس کے افراد خاندان کو روپ نگر

سے ہجرت کرنا پڑا تو وہ وہاں پونہ پہنچتے ہیں اور شہر سے دور اپنے تایا خان بہادر مرحوم کی کوٹھی میں قیام کرتے ہیں۔ وہاں پونہ اور میرٹھ کی طالب علمی کے زمانے میں ذاکر صرف ایک دوست بناتا ہے وہ ہے سرمیندر۔ سرمیندر ناول میں اہم کردار کی طرح تو نہیں ابھرتا لیکن اس کی Continuity آخر تک برقرار رہتی ہے۔ سرمیندر کے علاوہ ناول میں کئی واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جو ناول کے اختتام پر بھی دہرائے جاتے ہیں اس طرح ناول کا معنوی تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر روپ نگر میں جب طاعون کی وبا پھیلتی ہے تو کم و بیش ساری آبادی موت کے خوف سے بھاگنے لگتی ہے تو ایک دن بی اماں یعنی ذاکر کی دادی ذاکر کے والد کو مطلع کرتی ہیں

"بیٹے ناصر علی! تمہارے ماموں نے تار بھیجی ہے!"

ابا جان لمحہ بھر کے تامل کے بعد جواب دیتے ہیں

"بی اماں! حضور رسالت مآب نے فرمایا ہے کہ جو موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف بھاگتے ہیں"۔[1]

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۱۳

اس طرح یہ لوگ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاتے ۔ کچھ دنوں بعد بی اماں خواب میں امام کی سواری آنے کی اطلاع دیتی ہیں اور ابا جان میرا سی تامل کے ساتھ جواب دیتے ہیں "آپ کو بشارت ہوئی ہے"۔ اس بشارت کے ساتھ ہی طاعون کی وبا ختم ہو جاتی ہے ۔ ناول کے آخری حصہ میں جب ۱۹۷۱ء کی فوجی تاراجی کے بعد اسی طرح کی بھگدڑ مچتی ہے تو ابا جان پھر جعفر کی وہی حدیث دہراتے ہیں اور بالآخر ناول کا خاتمہ "بشارت" کے ذکر پر ہوتا ہے ۔

ناول کا پہلا باب موجودہ حالات کے تعلق سے بعض سنگین حقائق پر روشنی ڈالنے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کے باوجود زیادہ تر مافی بعید سے جڑا رہتا ہے۔

ذاکر اپنے گھر سے ملحق میدان میں ہر بار ایک زبردست سیاسی جلسے پر نظر ڈالتا ہے دریچہ بند کر کے کرسی پر آ بیٹھتا ہے اور صبح کے لکچر کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ اگلے صفحے کے ابتدائی سطور میں اس پر خود کلامی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

"آج کل تو جلسوں میں یہی ہوتا ہے۔ گالیوں سے شروع ہوتے ہیں اور گولیوں پر ختم ہوتے

ہیں۔ مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پر حیران
ہونے لگا۔ باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے
میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی
یادیں آرہی ہیں ..... میری
یادیں میرا جنگل ہیں ..... آخر یہ
جنگل کہاں سے شروع ہوتا ہے، نہیں۔
میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں ۔ اور
پھر وہ جنگل میں تھا۔" [1]

جنگل وہ مرکزی استعارہ ہے جس سے ذاکر کا مافی والبتہ ہے
اس جنگل کا روشن ترین منطقہ یعنی روپ نگر ذاکر کے خوشگوار
بچپن سے وابستہ ہے جسے ذاکر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔
وہ اکثر اپنی یادوں کے وسیع صحرا میں گم رہتا ہے۔ وہی صابرہ اور
ذاکر کے کھیل، بندو کے ساتھ ذاکر کا گھر سے گاؤں کے کالے مندر
تک اور کالے مندر سے کربلا تک کا سفر، گاؤں میں بجلی آنے کے
بعد مسجد میں بجلی لگنا سب کچھ اسے یاد آتا ہے۔ وہ یہ بھی یاد کرتا ہے

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۱۳

کہ کس طرح اباجان نے مسجد میں بجلی لگنے کو غیر شرعی فعل قرار دیتے ہوئے اس کی سخت مخالفت کی تھی اور کس طرح ان کی مخالفت کے باوجود مسجد میں بجلی لگی۔ اس واقعہ نے اباجان کو ناقابل برداشت ذہنی تکلیف پہنچائی اور نہ صرف انہیں گوشہ نشین بنا دیا بلکہ انہیں گاؤں چھوڑ کر ویاس پور ہجرت کر جانے پر مجبور کیا۔ ایک طرف تو نئی جگہ دیکھنے اور نئے لوگوں سے ملنے کی غیر شعوری خوشی اور دوسری طرف صابرہ سے علیحدگی۔ ذاکر کے ذہن میں بھولے بسرے زمانے کا وہ منظر یاد آتا ہے جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ویاس پور کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا اور صابرہ بندھتے ہوئے اسباب کو دیکھ کر شدت غم سے بے قابو ہو رہی تھی۔

ذاکر کی مجموعی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ناول کا چوتھا باب زیادہ اہم ہے۔ اس میں انتظار حسین نے پاکستان کے ابتدائی پرسکون اور خوشگوار دنوں کا ذکر کیا ہے۔ ذاکر کو وہ زمانہ یاد آتا ہے جب "پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا، جب پاکستان کا آسمان تازہ تھا، روپ نگر کے آسمان کی طرح اور زمین ابھی میلی نہیں ہوئی تھی۔"[1]

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۷۷

یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں کے دلوں اور گھروں میں ایک دوسرے کے لیے جگہ تھی۔ اس وقت کا معاشرہ عام طور پر معصومیت، بے لوث خلوص اور شرافت نفسی سے عبارت تھا لیکن رفتہ رفتہ قدریں بدلنے لگیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر نفرت، منافرت اور مفاد پرستی کا بول بالا ہو گیا۔ مادیت نے روحانی اور اخلاقی اقدار پر غلبہ پالیا اور ہر جانب خود غرضوں اور نو دولتیوں کا اسار نگ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی ہنگامے اور بازیگری نے پاکستان کو اس وقت کے مقابلے میں قطعاً مختلف بنا دیا تھا۔ جب ذاکر نے اس سرزمین پر پہلے پہل قدم رکھا تھا اس وقت اسے

"اس نئی سرزمین پر چلنے میں کتنی لذت مل رہی تھی۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک پر دوسری سڑک سے تیسری سڑک پر جاتے، وہ کتنی دیر چلتا رہا مگر ذرا وہ تھکا ہو۔ کتنے زمانے بعد وہ آزادانہ چل رہا تھا اس اندیشے سے بغیر کہ ابھی کوئی برابر سے گزرتے گزرتے پھر اس کے اندر اتار دے گا۔" [1]

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۷۷

جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی تحفظ کے ان خوشگوار احساسات کے ساتھ ذاکر نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور بقول انتظار حسین یہ آغاز آوارہ گردی سے ہوا۔ اس آوارہ گردی کے توسط سے زندگی میں ہم آہنگی اور ٹھہراؤ کی جستجو کرتا ہوا ذاکر "شیراز" پہنچتا ہے۔ شیراز اور وہاں کی زندگی کی تفصیل دراصل پاکستان میں برپا ہونے والے سیاسی ہنگاموں، آپسی نفرت، خانہ جنگی اور اخلاقی زوال کی تفصیل ہے جو دوسرے اور تیسرے ابواب میں پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب کے آغاز میں شیراز پہنچنے سے پہلے وہ اپنے کالج جاتا ہے صرف یہ دیکھنے کے لیئے کہ گملے جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں۔ کلاسیں خالی ہیں۔ شیشے دروازوں کے چکنا چور کچھ کلاسوں کے اندر کچھ باہر برآمدوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ کم وبیش وہی منظر ہے جس سے ذاکر اپنی طالب علمی کے زمانے میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے دوران دوچار ہوا تھا اور جس سے اب تاریخ کے کلیپر کی حیثیت سے دوچار ہو رہا تھا۔

شیراز وہ واحد پلیٹ فارم ہے جہاں ذاکر دوسروں سے تبادلہ خیال کر سکتا ہے یا حالات حاضرہ پر تبصرہ اور ان کا تجزیہ

کر سکتا ہے۔ جہاں ذاکر اور اس کے احباب سلامت، اجمل، عرفان اور اقبال روز جمع ہوتے ہیں یہ لوگ بیک وقت ایک دوسرے سے اتفاق رائے اور اختلاف رائے رکھتے ہیں۔

ناول کے ساتویں باب کے آغاز میں صبح گھر سے نکلنے پر ذاکر نے دیکھا کہ

"موٹریں، سائیکلیاں، رکشائیں تانگے سب سواریاں عجلت میں تھیں ایک دوسرے پر چڑھی جا رہی تھیں اسے سڑک عبور کرنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ سواریوں کو دیکھا رفتہ رفتہ ایک کار کہ اس کی پشت پر CRUSH INDIA لکھا ہوا تھا سواریوں سے بھری، سامان سے لدی فراٹے سے ساتھ اس کے برابر سے گذری چلی گئی۔ کار کی پشت پر لکھا ہوا لمحہ زرا دیر کے لیے اس کی نظروں کے سامنے آیا اور پھر اڑتی گرد میں دھندلا گیا۔" [1]

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۱۳۹

یہ منظر اس غیر متوقع صورت حال کا بیان ہے جب تمام دعوے
امداد کے تمام وعدے اور فوجی طاقت کے سلسلے میں تمام اندازے غلط
ثابت ہو جاتے ہیں اور ذاکر کے ملک کو بڑی حد تک ایک غیر متوقع
فوجی تاراجی کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ ذہنی طور پر ذاکر
کو فوجی تاراجی کے مقابلے میں اخلاقی اقدار کے زوال اور قومی کردار
کے بحران کا زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ اس روح فرسا منظر سے دوچار
ہونے کے بعد جب وہ شیراز پہنچا تو عرفان نے اطلاع دی کہ صرف
سڑک ہی نہیں ریلوے اور بس اسٹینڈوں کا بھی یہی حال تھا یعنی
جس طرح سے بھی ممکن ہو لوگ پہلی فرصت میں شہر چھوڑ کر بھاگ
رہے تھے۔ دوران گفتگو افضال اس واضح ترین صورت حال کی
علامتی تشریح کرنے کے لیے "جاتک" کے حوالے سے اس مسافر کی
کہانی سناتا ہے جس کا اس جلتے ہوئے چندن کے پیڑ کی طرف سے گزر
ہوا جس پر ایک راج ہنس مطمئن بیٹھا تھا مسافر کے اس استفسار
پر کہ

"اے راج ہنس! کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ
چندن میں آگ لگی ہوئی ہے پھر تو اڑتا کیوں

ہیں۔ کیا تجھے اپنی جان پیاری ہیں؟

راج ہنس یوں گویا ہوتا ہے

میں نے اس چمن کی چھاؤں میں بہت سکھ

پایا ہے، کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ اب جب کہ وہ

دکھ میں ہے میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں"۔

ذاکر اپنے دل و دماغ کو پراگندہ خیالی سے بچانے کے لیئے ڈائری

لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ڈائری نویسی کا یہ سلسلہ ۵/ دسمبر سے

۱۸/ دسمبر تک چلتا ہے۔ ۱۸/ دسمبر کو لکھی گئی ڈائری کا آخری پیراگراف

خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ذاکر نے جنگ اور اس کے ہولناک نتائج

کے تعلق سے اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"میں اس شہر کے لیئے کچھ نہیں کر سکتا صرف

دعا کر سکتا ہوں سو کرتا ہوں۔ یہ میرے

لفور میں آباد روپ نگر کے لیئے بھی دعا ہے

کہ اسے میں اب اس شہر سے الگ کر کے لفور

میں نہیں لا سکتا۔ روپ نگر اور یہ شہر

میرے اندر گھل مل کر ایک بستی بن گئے ہیں"۔ [1]

---

[1] "بستی" انتظار حسین ص ۱۲۸

یہ پیراگراف نہ صرف ناول بلکہ پورے موضوع کی بھی وضاحت کر دیتا ہے۔

انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے وہ زیادہ تر ان لمحوں کو یاد کرتے رہتے ہیں جنھیں وقت نے دور کر دیا ہے۔ ان کے کردار اور علامتیں اپنی تہذیبی شعور کی پیداوار ہیں۔ افراد ہوں یا معاشرے ان کی نظر انسان کے روحانی اخلاقی زوال اور داخلی و خارجی رشتوں کے حد و تناسب کی مختلف جہتوں پر رہتی ہے۔ آج کا انسان اور سماج جس طرح منافقت، نفس پروری خود غرضی اور ریاکاری اور اس طرح کی ہزاروں دوسری لعنتوں میں گھرا ہوا ہے اس لیے اپنی شخصیت کی پہچان اور اپنی ذات کو برقرار رکھنا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ انتظار حسین انسان کی اسی تگ و دو اور تڑپ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا فن آج کے انسان کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن ہے تاکہ مستقبل میں انسان اپنی آگاہی حاصل کر سکے اور اپنی ذات کو برقرار رکھ سکے۔

# تلاشِ بہاراں

جمیلہ ہاشمی

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب میں کئی اہم ناولوں
کا اضافہ ہوا اور ناول کے موضوعات کو وسعتیں حاصل ہوئیں۔ اس
دور میں بعض ایسے ناول بھی منظر عام پر آئے جنھیں قدر کی نگاہ
سے تو دیکھا گیا مگر ان کی فنی حیثیت کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔
جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔
ایک قوم بہاروں کی تلاش میں سو برس تک سرگرم عمل رہتی
ہے اور ان عملی سرگرمیوں کا نتیجہ خوں ریزی اور فرقہ وارانہ
فسادات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ناول کا پلاٹ یادداشت کے سہارے ترتیب دیا
گیا ہے۔ یہ ایک ایسے مرد کی یادداشت ہے جو کنول کماری ٹھاکر سے
بہت متاثر ہے اس کا جذبہ محبت عقیدت میں بدل گیا اور یہ عقیدت
اس حد تک بڑھی کہ اس نے اپنی لڑکی کی تربیت اسی انداز سے کی
جس سے کنول کماری کا پرتو اس میں ظاہر ہو سکے۔

ناول کا انداز تحریر بیانیہ ہے اس لیے راوی واقعات
کو قصے کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ دوشیزہ کمار اور کرشنا بوس کے

مقدمہ سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ رویندر اعلیٰ ذات سے تعلق
رکھتا ہے اور کرشنا بوس ولیش ہے دونوں شادی کر لیتے ہیں مگر
رویندر کے والدین اس شادی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں چناں چہ
رویندر کمار کو کرشنا سے الگ کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ
کھٹکھٹایا جاتا ہے اس موقع پر کنول کماری کرشنا کے دفاع کے لیے
سامنے آتی ہے وہ خود برہمن خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر ذات
پات کی تفریق اور تعصب سے بہت بلند ہے۔ کرشنا سے رویندر
کی علیحدگی کو تمام عورتوں کی توہین تصور کرتی ہے چناں چہ کرشنا
کی حمایت میں پرزور بیان دیتی ہے پھر اس کا تعلق مختلف سماجی
تحریکوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ عورتوں کی بیداری اور عورتوں
کے حقوق کے حصول کے لیے جد وجہد کرتی ہے اور خود بھی شادی
نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جاں
توڑ کوشش کرتی ہے وہ اس خیال کے ساتھ تحریک چلاتی ہے
کہ عورتیں اگر دیوی نہیں تو وہ رہ گزاروں کی خاک بھی نہیں۔
چناں چہ اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لیے وہ جلسوں اور جلوسوں
کی قیادت کرتی ہے اور حقوق نسواں کے سلسلے میں پیدا شدہ

کمزوریوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ملک کی آزادی کی جنگ کے لیے
کنول کماری عورتوں کو اپنے نقطہ نظر کے تحت منظم کرتی ہے
سیاسی لڑائی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں
کے مذہبی جذبات کو جگا کر فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک کے حصے
کرنے کی سیاسی سازشیں ہوتی ہیں تو کنول کماری اپنے پرستاروں
کے ساتھ اس تحریک کی پرزور مخالفت کرتی ہے۔ اس کی تمام کوششیں
ناکام ہوتی ہیں اور ملک کی تقسیم کا عمل جبراً سامنے آتا ہے تو
فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ کنول کماری کالج
میں زیر تعلیم مسلمان لڑکیوں کو بچاتے ہوئے اپنی جان کی قربانی
دے دیتی ہے۔ یہ کل یادداشت کا خلاصہ ہے جس کے سہارے
جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناول کا کینوس تیار کیا ہے۔

اس ناول کا اہم ترین کردار کنول کماری ٹھاکر ہے
اس میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ لیاقت، قوم پرستی، اصلاحی جذبہ
خدمت خلق، انتظامی صلاحیت، الفاف پسندی، حب الوطنی غرض
لاتعداد خوبیاں موجود ہیں۔ بہت اچھی وکیل ہے۔ ہمیشہ عورتوں
کے مقدمے لڑتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے۔ متعدد غریب عورتوں

کی مدد کر چکی ہے اور کئی عورتوں کی کفالت کر رہی ہے۔ لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود نسوانیت سے عاری دکھائی دیتی ہے۔ اس کے اندر کی عورت کبھی نہیں جاگتی جس کی وجہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ عورت نہیں دیوی ہے جسے اپنے نفس پر قابو ہے۔ اس کی زندگی میں مرد نام کی کوئی چیز نہیں۔ حالاں کہ اس کے کئی چاہنے والے ہیں جن میں راجندر منموہن اور رادھے کرشن اہم ہیں لیکن محبت کے معاملے میں وہ کبھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی بلکہ اس کے سامنے نصب العین ہے اور وہی اس کے لیئے سب کچھ ہے۔ جب تحریک آزادی زور پکڑتی ہے اور تقسیم ہند کا زمانہ قریب آتا ہے تو کنول کماری ٹھاکر کا جذبہ انسانیت اپنے معراج پر نظر آتا ہے۔ اسی زمانے میں منادان کے دوران بلوائی ہاسٹل کی مسلمان لڑکیوں کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں کنول کماری ان کو روکتے ہوئے اپنی جان دے دیتی ہے۔

"کنول خواب میں چلنے اور رونے والوں کی طرح اپنی بے ہوشی کے عالم میں کہتی ہے انسانیت کو بچاؤ، کوئی میری بچیوں کو بچاؤ، کوئی میری آن اور عزت کو بچاؤ" [1]

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۶۳۷

یہ ایک اہم کردار ہے جس پر جمیلہ ہاشمی نے بہت زیادہ محنت کی ہے۔

ناول کے دوسرے کردار چند دشکھر، گنگا دھر

فرقہ پرست، رجعت پسند اور مسلم دشمن کردار ہیں انھیں مسلمانوں

کے وجود ہی سے نفرت ہے۔ یہ لوگ ترقی پسند، روشن خیال اور

معصوم ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت اور تعصب کا

بیج بوتے اور ان کو گمراہ کر کے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرتے

ہیں۔ لیکن ایسے کردار ہم کو مسلمانوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ جمیلہ

ہاشمی نے صرف ہندو کرداروں کو فرقہ پرست بتایا ہے۔

تقسیم ہند کے سلسلے میں رادی کا بیان ملاحظہ ہو۔

"غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلا لیا تھا اس کا

وار خالی نہیں گیا۔ صدیوں سے ملک میں

رہنے والے پھوٹ کی وجہ سے ایک دوسرے

کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مسلمان اور

ہندو کا سوال۔ روایتوں کا سوال۔ الگ

تمدن کا سوال۔ الگ ملک کا سوال درپیش

تھا اور جذباتی عوام اس کو ایک مذہبی

رنگ دے رہے تھے۔ راجپوتانہ کے شیر ببروں
نے اکبر اور اورنگ زیب کے درباروں میں داد
شجاعت دینے کے بدلے انعامات حاصل کیئے تھے
مغلوں کے دربار میں ہندو اور مسلمان سر جوڑ
کر حکومت کے مسائل پر غور کرتے رہے تھے پھر
غلامی کا ایک دور آیا۔ انگریزوں نے ملک کو
تباہی کے بیج بو کر کاٹنے کے لیئے تیار کر لیا تھا
ہر روز جلسے ہوتے۔ جلوس نکالے جاتے
اور مادر ہند کے حصے بخرے کرنے کی تیاری
ہونے لگی۔ صدیوں کے بھائیوں کو ایک دوسرے
کے خلاف شکایت ہونے لگی .....
منادات ہو رہے تھے جگہ جگہ سے لوگ ایک
دوسرے کے گلے کاٹتے گھروں کو آگ لگاتے
ہجوم کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔" [1]

ناول نگار نے ملک کی تقسیم کے مسئلے کو ایک مورخ کی نظر سے

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۱۷۱م - ۱۷۲م

دیکھا اور لکھا ہے۔ تقسیم ہند کے فسادات میں انسان اپنی انسانیت کھو کر درندہ بن چکا تھا لیکن ایسے ہر آشوب دور میں بھی بعض ہستیاں ایسی تھیں جو اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس بربریت کی کھلی مخالفت کر رہی تھیں۔ چناں چہ ناول کی ہیروئن کنول کماری ٹھاکر کہتی ہے

"کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو ان حد بندیوں
سے بلند ہو کر محض انسانیت کے لیے کام
کرے کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنے ذاتی
مفاد کو نظر انداز کر کے صرف انسان بن
کر ان سارے اختلافات کو مٹانے کی
کوشش کرے۔" [1]

کنول کماری ٹھاکر خود یہ کام انجام دیتی ہے۔ کالج کی لڑکیوں کی حفاظت کرتے ہوئے کنول کماری نے جن مسائل کا سامنا کیا اس کا بیان قاری کو تھرا دیتا ہے۔

تقسیم ہند کے متعلق شوبھا کے خیالات اس کے ایک خط

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۵۰۹

کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔

"ہمارے دشمن سوچی سمجھی تجویزوں کے تحت
دوستوں کے بھیس میں ہمارے درمیان گھومتے
اور ہمیں بتاتے ہیں کہ تباہی سے بچنے کی یہی صورت
ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہو رہے ہیں تو ہونے
دیئے جائیں مسلم اور ہندو وجود کے الگ الگ
حصے ہیں ان کو الگ ہو جانا چاہیئے اور مجھے یہ سب
باتیں سن کر اپنا جسم ہوتا ہوا اور اپنا دل بجھتا
ہوا لگتا ہے ..... مجھے معلوم ہے ہم مر کر
بھی ہندو اور مسلم نہیں ہو سکتے ہم صرف انسان
ہیں یہ ہمارا پیارا سا گھر ہے اور اس کی تباہی
اگرچہ یقینی ہے پھر بھی بہت تکلیف دہ اور
قاتل ہوگی۔" [1]

راوی کی بیٹی بینا تنیم کے متعلق کہتی ہے

"بابا آپ اخبار کے ذریعہ حکومت پر زور

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۵۱۴

کیوں نہیں دیتے کہ وہ ایک دم امیں باتیں بند
کر دے ۔ جو لوگ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان
کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں ان کو بتانا
چاہیئے کہ بٹ کر ملک کی شکتی کم ہو جائے گی
ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کمزور
ہو جائیں گے اور پھر ہم تو صدیوں سے اس
ملک میں اکٹھے رہتے آئے ہیں۔" [1]

آزادی اور ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی بربریت اور انسانیت سوز واقعات کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہوا اس کی عکاسی نادل میں اس طرح کی گئی ہے ۔

"شہر میں جانا ناممکن تھا ۔ ایک قیامت تھی
آگ کے شعلے بارش کے باوجود بلند ہو رہے
تھے لوگ بھاگ رہے تھے ۔ عورتیں چھتوں سے
چھلانگیں لگا رہی تھیں ۔ ننگے سر ننگے پیر
بھاگ رہی تھیں ۔ مرد روتے ہوئے آگ

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۵۲۱

کے شلوں میں دھکیلے جا رہے تھے گولیاں چلنے
کی آواز آتی۔ کوا ڑ دھڑ دھڑائے جاتے۔ دستی
بم پھینکے جا رہے تھے۔ چیختے اور چلاتے بچوں
کو نیزوں پر لٹکایا جا رہا تھا ان کو زندہ ہی
آگ میں بھونا جا رہا تھا۔ عورتیں بال بکھرائے
وحشت سے آنکھیں کھولے بھاگ رہی تھیں
نازک اندام لڑکیاں ننگی بپھرائی ہوئی شکلوں
سے برستی بارش میں قطاروں میں کھڑی کر دی
گئیں تھیں مردانیں دیکھ کر ہنستے اور شراب
سے مدہوش ہو کر جس کو جی چاہتا کھینچ لیتے۔
ان لڑکیوں کے آنسو کہاں تھے؟ خدا کہاں تھا؟
بھگوان کہاں تھا؟ وہ مقدس نام کہاں تھے
جن کے سہارے انسان زندہ تھا۔" [1]

اس افراتفری کے عالم میں جب کہ لوگ اپنے ہی گھر کی عزت
اپنے ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے وہیں ایک غیر ملکی ان مظلوموں

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۶۳۵

کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا کردار ہندوستانیوں کے منہ پر
ایک طمانچہ ہے۔

"ڈون وارٹن ہجوم میں گھس گیا تھا کسی
لڑکی کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی مجھے چھوڑ دو
مجھے چھوڑ دو۔ پھر مجھے ڈون وارٹن
کی آواز آئی تم ہندوستانی ہو جو اپنی
عورتوں کو مار رہے ہو اپنی عزت
برباد کر رہے ہو۔" [1]

اس طرح یہ ناول اپنے موضوع کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ آزادی
کی متوالی کنول کماری نے فنا کر کے اپنی ساری زندگی ملک کی لڑکیوں
کی خدمت میں صرف کر دی تاکہ وہ آنے والے آزاد ہندوستان کی
بہتر مائیں اور بہنیں بن سکیں اور سماج کی اصلاح ہو سکے لیکن اس
کے خوابوں کی تعبیر فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے آئی اور
وہ خود اس آگ میں جل گئی۔ کیا اس کی یا اس کی طرح اور دوسرے
لوگوں کی قربانیوں کا ماحصل یہی بہاریں تھیں؟

---

[1] "تلاش بہاراں" جمیلہ ہاشمی ص ۶۳

# اُداس نسلیں

عبداللہ حسین

"اداس نسلیں" ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے
سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر محیط ہے۔ اس میں ناول
نگار نے اس نکتہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کا ماحول
ہی اس کی اداسی کا سبب بنتا ہے۔ ماحول کا انتشار اور بے چینی منتشر
ذہن بناتی ہے جس کے نتیجہ میں صحیح اور غلط کی تمیز ختم ہو جاتی ہے
یہاں تک کہ قوت فیصلہ بھی ختم ہو جاتی ہے اور ایک انسان دوسرے
انسانوں پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اس
کا ذہنی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ ذہنی سکون کا یہ فقدان پوری نسل کی
اداسی کا سبب بن جاتا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں

"اداس نسلیں" پہلا ناول ہے جس میں پہلی
جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک برطانوی
سامراج کی سیاسی ریشہ دوانیوں، تحریک
آزادی کے مرحلوں اور اس تحریک میں
کسان مزدور طبقے کے حصے اور حیثیت کو

پنجاب کے ایک کسان کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا
اور پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے شاید اپنے
طبقاتی تعلق، تحریک آزادی میں متوسط طبقے
کے کردار اور قربانیوں پر زور دیا ہے حالاں کہ
واقعہ یہ ہے کہ اس جدوجہد میں سب سے زیادہ
ہلاکت، تباہی اور تاراجی محنت کش انسانوں
کا مقدر رہی ہے۔ عبداللہ حسین کے تاریخی شعور
نے اس پہلو پر زور دے کر ناول کو حقیقت نگاری
اور فن حسن کی نئی اقدار سے روشناس کرایا
ہے۔" [1]

دیوندر اِسّر کا خیال بھی ملاحظہ ہو

"اداس نسلیں ہندوستانی تاریخ کے ایک
اہم دور ۱۹۱۳ء-۱۹۴۷ء کو پیش کرتی ہے
اس میں تو تاریخ، واقعات اور کرداروں
کی پیچ در پیچ ساخت کو بڑی خوبی سے پیش

---

[1] "تلاش و توازن" پروفیسر قمر رئیس ص ۵۵

کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ ایک مربوط ڈھانچے
میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ناول میں زبانی جذبات
و احساسات، مسرتوں اور خواہشوں، ناکامیوں
اور نامرادیوں، خوابوں اور خوف کو بڑے
جاندار طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اداس نسلیں
ہمارے دور کی بے چینی اور ذہنی کرب کو قاری
تک منتقل کرنے میں کامیاب ہے۔ آزادی کے
بعد جن تین چار ناولوں کو ادبی اہمیت حاصل
ہے "اداس نسلیں" ان میں ایک اہم ناول ہے"۔ [1]

"اداس نسلیں" کی کہانی ہندوستانی معاشرے سے براہ راست متعلق
ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے لے کر ملک کی تقسیم تک کے واقعات اور
سیاسی تغیرات و تحریکات کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔

ناول میں روشن پور کی کہانی پیش کی گئی ہے جو دہلی
اور پنجاب کی سرحد پر واقع ہے۔ غدر کے بعد ہندوستان میں دو
طرح کے جاگیردار وجود میں آئے ایک وہ جنھیں انگریزوں سے وفاداری

---

[1] "آج کل" (دہلی) اگست ۱۹۶۲ء ص ۳۸

کے صلہ میں جاگیریں عطا کی گئیں دوسرے وہ چھوٹے زمیندار جنھیں
بڑے جاگیر داروں سے تعلقات کی بنا پر کچھ زمین مل جاتی تھی۔ روشن
آغا بھی ایک ایسے ہی جاگیر دار ہیں جنھیں کرنل جانسن کی جان بچانے کے صلہ
میں روشن پور بلور جاگیر ملا۔ روشن آغا نے اپنے دوست محمد بیگ
کو کچھ زمین عطا کی جس کی وجہ سے وہ چھوٹے زمیندار بن گئے۔ محمد بیگ
کے انتقال کے بعد ان کے دو بیٹوں ایاز بیگ اور نیاز بیگ کی
پرورش روشن آغا نے کی۔ نیاز بیگ کو حکومت کے خلاف کسی جرم
میں سزا ہو گئی۔ ایاز بیگ نیاز بیگ کے لڑکے نعیم کو لے کر کلکتہ چلے
گئے۔ روشن آغا دہلی میں روشن محل میں اکیلے رہنے لگے۔ ایاز بیگ اور
نعیم جب دہلی آتے تو روشن محل کی پارٹیوں میں شرکت کرتے۔
نعیم نے کلکتہ میں سینئر کیمرج تک تعلیم حاصل کی۔ روشن محل میں
نعیم کی ملاقات عذرا سے ہو گئی۔ اسی دوران نیاز بیگ جیل سے
رہا ہو گیا۔ نعیم اپنے والدین سے ملنے روشن پور گیا تو وہیں کھیتی کے
کام میں لگ گیا۔ نیاز بیگ کی حالت زمیندار کی نہیں بلکہ ایک غریب
کسان کی تھی۔ اس زمانے میں انگریز کسانوں کو پکڑ پکڑ کر فوج میں
بھرتی کر رہے تھے نعیم بھی فوج میں شامل ہو گیا۔ ان نوجیوں کو کراچی

تاہرہ، فرانس ہوتے ہوئے لڑائی کے محاذ پر بلجیم لیجایا گیا۔
نعیم کے گاؤں کے کئی جوان اس کے ساتھ تھے۔ جنگ میں بہت سے
جوان مارے گئے اور نعیم کا بازو کٹ گیا اس لیئے نعیم کی ڈیوٹی
ہر گیڈ ہیڈ کوارٹر پر مرہٹوں کی دیکھ بھال کے لیئے لگائی گئی۔ ان
مرہٹوں میں ایک حبرمن سے نعیم کی دوستی ہو گئی وہ کاریگر تھا اس
نے نعیم کا بازو بنا دیا۔ نعیم اعزاز حاصل کر کے گاؤں واپس آ گیا۔
گاؤں آکر اس نے زمینداروں کے خلاف تحریک شروع کی۔
کانگرس کا ممبر بن گیا۔ نیاز بیگ کے انتقال کے بعد وہ کاشت کرنے
لگا۔ خاندانی مخالفت کے باوجود عذرا سے شادی کر لی۔ جب جلیان
والا باغ کا حادثہ ہوا تو کانگرس کی انکوائری کمیٹی میں نعیم کو
بھی شامل کیا گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد اس نے کسانوں کی زبوں
حالی کا معائنہ کرنے کے لیئے مختلف گاؤں کا دورہ کیا۔ پرنس آف
ویلز کی آمد پر کانگرس نے بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا نعیم نے
گرفتاری دینے کا ارادہ کیا لیکن عذرا نے نعیم کو اس بات پر
آمادہ کیا کہ وہ گرفتاری نہ دے کر پرنس کے خلاف مظاہرہ
کریں گے۔ چناں چہ عذرا اور نعیم مظاہرے کے لیئے کلکتہ گئے۔

شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ پرنس کی سواری نکلی تو مظاہرین نے

TELL YOUR MOTHER "WE ARE UNHAPPY"

کے پوسٹر پر وجکٹ کیے۔ دہلی سے نعیم کو جاٹ نگر میں جلسہ کرنے کی ہدایت ملی اس جلسے میں نعیم گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم کو جیل میں سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں اس کے کافی دوست جیل میں آ گئے۔ سائمن کمیشن کی آمد پر لکھنو میں سخت مظاہرہ کیا گیا جس میں عذرا بی شامل ہوئی۔ نعیم لکھنو میں ہی قید تھا عذرا نعیم سے ملنے بھی گئی جب روشن آغا کو اس بات کی خبر ملی تو وہ عذرا سے ناراض ہو گئے۔ نعیم رہا ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی علی کو شہر میں لے جا کر مل میں نوکر رکھا دیا۔

مسلم لیگ منظم ہو رہی تھی۔ دوسری مسلم جماعتیں بھی لیگ میں شامل ہو رہی تھیں۔ مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ نعیم جب دوبارہ جیل سے واپس آیا تو اس پر فالج کا اثر ہو گیا عذرا بغرض علاج اسے دہلی لے گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے اس کا علاج کیا۔ ڈاکٹر انصاری مذہبی آدمی تھے ان کے خیال میں

"مذہب آج بھی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ سائنس

کی حیرت انگیز ترقی میں بھی مذہب اعلیٰ

ترین قوت ہے۔" [1]

ڈاکٹر الفاری، عذرا اور نعیم کے درمیان مذہب اور تہذیب پر مباحث ہوتے جس میں اس بات کا اظہار ہوتا کہ مذہب کا ناجائز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیے۔ کسی تہذیب کی تشکیل مذہب کے نام پر نہیں ہوتی۔ مذہب اور تہذیب پر یہ بحث اس وقت کے سیاسی ماحول کو پیش کرتی ہے۔ اس وقت مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت کے سیاسی پس منظر کا بیان ناول میں اس طرح کیا گیا ہے۔

"پارلیمنٹ میں عجیب گہما گہمی تھی۔ ہند کی مکمل آزادی کے لیے آخری گفت و شنید ہو رہی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اٹھارہ اگست کے گھنٹے پارلیمنٹ میں اور گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرنسیں بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر

---

[1] "اداس نسلیں" عبداللہ حسین ص ۶۵۰

سے سیول نافرمانی کی خبریں موصول ہوتی رہتی
تھیں۔ ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں کانگریس
اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی میں جمع تھے اور وائسرائے
ماؤنٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے ہر
طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ملک کے
مستقبل کے متعلق ہر کوئی اپنی سی پیش گوئی
کر رہا تھا لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مکمل بے یقینی
اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔ روزانہ
زندگی کا ہر کاروبار معطل ہو چکا تھا ملک کے
بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اور لوگ ایک
جاں گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے
چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ
دور دورہ تھا کہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔" [1]

اس ابتری کے عالم میں پرویز (روشن آغا مالرکا) نے لاہور
جانے کا فیصلہ کر لیا اور تمام امداد کو لے کر روانہ ہو گیا لیکن

---

[1] "اداس نسلیں" عبداللہ حسین ص ۸۰۸ - ۸۰۹

روشن آغا نے اپنا محل اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ ان کے گھر پر حملہ نہ ہوا۔ اسی رات جس دن پرویز گھر سے نکلا بلوائیوں نے روشن آغا کے محل پر حملہ کر دیا۔ روشن آغا اور ان کا خادم پچھلے دروازے سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ دہلی ایئرپورٹ پر پرویز مل گیا لیکن ہوائی جہاز جا چکا تھا یہ لوگ بذریعہ ٹرین لاہور گئے۔

دہلی سے پچاس لوگوں پر مشتمل ایک قافلہ روانہ ہوا جس میں نعیم بھی شامل تھا۔ اس قافلے کی تعداد بڑھتے بڑھتے ہزاروں تک پہنچ گئی۔ اسی قافلے میں نعیم کا بھائی علی بھی تھا۔ علی کی بیوی راستے ہی میں مر گئی اور نعیم غائب ہو گیا۔ کسی طرح علی امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر سے بذریعہ ٹرین لاہور پہنچا۔

پرویز کو سکریٹریٹ میں نوکری مل گئی اور رہنے کے لیے راج منزل۔ روشن آغا کے آخری دن تھے وہ جانکنی کے عالم میں تھے۔ راج منزل کو روشن محل میں تبدیل کرنا چاہتے تھے پرویز نے جیسے ہی روشن آغا کو یہ خبر دی کہ راج منزل کا نام بدل کر روشن محل کر دیا گیا تو روشن آغا کی سانس رک گئی۔

اس ناول میں عبداللہ حسین نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں جاگیردارانہ نظام اور شہری اور دیہی زندگی کو پیش کیا ہے۔ تقسیم کے بعد جاگیردار کا خاندان بکھر جاتا ہے اور وہ نئے ملک پاکستان میں پھر سے اپنی حیثیت نئے طریقے سے بنا لیتا ہے لیکن کسان اور مزدور جو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے وہ وہاں بھی اپنا مقام نہیں بنا سکے۔ ناول نگار نے علی کے کردار میں مزدوروں کے تمام دکھوں اور سکھوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ علی کی زندگی پورے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے۔

دوسرے تمام علاقوں کی طرح روشن پور میں بھی ہندو مسلم بھائی چارہ تھا لیکن جب مذہب کی بنیاد پر فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو روشن پور میں بھی منافرت پیدا ہو گئی اور ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ زمینداری جس کا خاتمہ یعنی تھا گاؤں کے لوگوں کا تقادم زمینداری سے نہ ہو کر مسلم زمیندار سے ہوا۔ پرویز پاکستان جانے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن روشن آغا اپنا آبائی وطن نہیں چھوڑنا چاہتے تھے ان کو روشن پور والوں پر بھروسہ تھا۔ پرویز انھیں سمجھاتا

"روشن پور روشن پور یہاں بیٹھ کے آپ کہتے
ہیں آپ کا خیال ہے کہ روشن پور کے لوگ
ابھی تک آپ کے وفادار ہیں؟ آج آپ
روشن پور میں داخل نہیں ہو سکتے انہوں نے
منشی کو اور ہمارے سب کارندوں کو قتل
کر دیا ہے آج ہمیں وہاں کوئی نہیں جانتا" [1]

پیرویز کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ روشن محل میں آگ لگا دی گئی۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم کی گئی تھی۔ عبداللہ حسین کے خیال کے مطابق مذہب اور تہذیب کا کوئی میل نہیں کیوں کہ تہذیب کا دار و مدار محض طبقاتی تقسیم پر ہے جس کی تشکیل میں کسی جماعت کے معاشی حالات اور وسائل کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اسی لیے تہذیب ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے جب کہ مذہب ہمیشہ ایک ہی فارم میں موجود رہتا ہے چناں چہ ان کے خیال میں سوسائٹی کو مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقل سلیم پر قائم کرنا چاہیے۔ مذہب کو ہر بار ناجائز طور پر استعمال کیا گیا اس کا استعمال تقسیم ہند کے وقت

---

[1] "اداس نسلیں" عبداللہ حسین ص ۸۱۵

بھی ہوا اس لیئے ناول نگار نے یہ رائے پیش کی

"ہمیں پتہ ہے جب سے منظم مذہب کی
بنیاد پڑی اسے کتنی بار ناجائز طور پر استعمال
کیا گیا ہے..... آج تک کتنی جنگیں
مذہب کے نام پر ہوئی ہیں..... کیا
ہم ایسی سوسائیٹی نہیں بنا سکتے جس کی
بنیاد عقل سلیم پر رکھی گئی ہو..... جس
میں ہم اپنے ہر اچھے برے عمل کے لیئے
سوچیں اور فیصلہ کریں اور اس کے
ذمہ دار ہوں" [1]

ناول نگار نے ان خیالات کو پیش کر کے تقسیم ہند کی بنیاد کو مسترد کر دیا کہ ملک کی تقسیم مذہب اور تہذیب کے نام پر نہیں کی جا سکتی۔ عبداللہ حسین نے تقسیم کے واقعات کو بہت درد و کرب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند پر اس ناول کا خاتمہ اس المیہ کو ثابت کرتا ہے کہ تقسیم اتنا بڑا المیہ ہے کہ جہاں ہزاروں

---

[1] "اداس نسلیں" عبداللہ حسین

کہانیاں دم توڑتی ہیں۔ تقسیم ہند کے پودے میں منظر کو انھوں نے
ناول میں اس طرح سمویا ہے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔
بقول ڈاکٹر قمر رئیس

"ناول کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ
مصنف نے آزادی کو غلامی، انسانیت
کو بہیمیت پیار محبت امن اور انسانی
دوستی کی قوتوں کو نفرت، جنگ اور
نفاق کی سازشوں پر ترجیح دی ہے
اس لیے اس میں کسان اور محنت کش
طبقہ کی آزادی، خوشحالی اور آسودگی
کے خوابوں کی تعبیر ملتی ہے جو فرد
اور معاشرے کے حالات، خیالات
جذبات کو ابھار کر ایک دم ہمارے
سامنے رکھ دیتی ہے" [1]

---

[1] "تلاش و توازن" ڈاکٹر قمر رئیس ص ۵۷

# آنگن زمین

خدیجہ مستور

یہ ناول دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے شروع ہو کر قیام پاکستان کے کچھ بعد تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت سادہ ہے۔ یہ ماضی اور حال کے درمیان گردش کرتا ہے۔ ماضی کا حصہ مختصر ہے جسے فلیش بیک کی تکنیک میں بیان کیا گیا ہے۔ حال کا حصہ بہت طویل ہے۔ ساری کہانی عالیہ کی زبانی ادا کی گئی ہے۔

خدیجہ مستور نے "آنگن" میں آزادی سے قبل کے ایک متوسط مسلم گھرانے کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ عالیہ ناول کی ہیروئن ہے اس کے والد انگریز افسر کا سر پھوڑ کر جیل چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ان کی لاش ہی نکلتی ہے۔ عالیہ بڑے چچا کے گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہے یہ کانگرس کے سرگرم رکن ہیں نیم مذہبی اور نیم سیاسی ماحول کی وجہ سے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہے۔ بڑے چچا اپنی سیاست میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ دکان سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور دکان نوکروں کے حوالے ہونے کی وجہ سے گھر کی حالت روز بروز گرگوں ہوتی جاتی ہے۔

اولاد کی تربیت پے تو جبھی کا شمار ہونے کے نتیجے میں چھوٹا
لڑکا شکیل آوارہ ہو جاتا ہے اور بڑا لڑکا جمیل ب۔ اے کر کے مسلم لیگ
کا ممبر بن جاتا ہے۔ چونکہ بڑے چچا کانگریسی ہیں اس لیے باپ
بیٹے میں بات چیت بند ہو جاتی ہے۔ جمیل پہلے جھجی اور پھر بعد
میں عالیہ کی طرف راغب ہوتا ہے لیکن عالیہ اس کو قابل نہیں
سمجھتی۔ ملک کی تقسیم اور آزادی کے ساتھ فسادات شروع
ہو جاتے ہیں اس میں بڑے چچا قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جمیل مسلم
لیگ کا ممبر ہوتے ہوئے بھی پاکستان جانا پسند نہیں کرتا اور ایک
معمولی سی نوکری پر قناعت کر لیتا ہے۔ آخر میں جھجی سے
شادی کر لیتا ہے جو اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے چکی ہے۔ عالیہ
اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان چلی جاتی ہے جہاں اس کے ماموں نے
کوئی دلوا دی تھی۔ لاہور میں عالیہ کی دوستی ایک ڈاکٹر سے
ہوتی ہے لیکن اس سے شادی نہ ہو سکی۔ پھر اس کی ملاقات
صفدر سے ہوتی ہے جو اس کا یوپی دار بھائی ہے جس کی
محبت میں اس کی بڑی بہن تہمینہ نے خودکشی کی تھی۔ صفدر
اپنی چچی سے رشتے کی بات کرتا ہے پہلے تو عالیہ راضی ہو جاتی

ہے لیکن جب وہ محسوس کرتی ہے کہ صفدر وہ صفدر نہیں رہا جس
کے لیئے تہمینہ نے اپنی جان دے دی تھی وہ اپنے اصولوں سے ہٹ
گیا ہے تو اس نے شادی سے انکار کر دیا۔

"آنگن" ایک خاندان کے شیرازہ بکھرنے کی داستان
ہے جس کو خدیجہ مستور نے بہت ہی ستھرے اور سادے انداز سے
پیش کیا ہے۔ "آنگن" کے متعلق پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں

"خدیجہ مستور کا یہ ناول ۱۹۳۲ء کے
آس پاس شروع ہو کر تقسیم کے چند سال
بعد تک کے زمانے پر محیط ہے۔ دوسری
بات یہ کہ مشترکہ ہندوستان کے اقتصادی
نظام، تہذیبی سماج اور سیاسی ابھار
میں متوسط طبقے کے مسلمانوں کی جو حیثیت
اور حصہ رہا ہے خدیجہ مستور نے اپنے ناول
میں اس کی بازیافت یا ترجمانی کا عزم
کیا اور اس عہد کی سیاسی فضا میں
پیدا ہونے والی ہر لہر کو ناول میں سمونے

اور جذب کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے
کرداروں کے ذہنی، جذباتی اور باطنی وجود پر
اپنی توجہ مرکوز رکھی۔" [1]

خدیجہ مستور نے "آنگن" میں اپنے دور کے ایسے لازوال کردار
تراشے ہیں جو اپنے عہد کے نمائندے بن کر ابھرتے ہیں۔ بقول
EDWARD

"جہاں تک ناول نگار کا تعلق ہے اس کا
کام انسانی زندگی کو پیش کرنا ہے ایسی زندگی
کو جو تمام زمانوں پر حاوی ہو اور ایسے کردار
تراشنا جو کسی مخصوص عہد کے جذبات سے مشترک
نہ ہو۔" [2]

ناول کا ہر کردار ہماری زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔
اس ناول کے تمام کردار ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس
میں کوئی مسلم لیگی ہے تو کوئی کانگرسی۔ لیکن جدوجہد آزادی

---

[1] "تلاش و توازن" پروفیسر قمر رئیس ص ۵۷

[2] بحوالہ "اردو ناول پر یم چند کے بعد" ڈاکٹر ہارون ایوب
ص ۳۰۳

سے تمام کردار وابستہ ہیں۔

بڑے چچا نیم مذہبی قسم کے آدمی ہیں اور کانگریس کے سرگرم کارکن۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے گھر اور کاروبار کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں نتیجہ میں سارا گھر برباد ہو جاتا ہے۔ گھر والوں کی بے راہ روی کی وجہ سے ان پر ناراض ہوتے ہیں لیکن ان کی بات کوئی نہیں سنتا۔ ان کا بڑا لڑکا جمیل اپنے باپ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ہمارے ابا کی رگ رگ میں بزرگ اللہ ہو گی
واہ کیا عظیم آدمی ہیں ہمارے ابا بھی۔ یہ گھر
ان کی عظمت کا مثالی نمونہ ہے برسوں سے
کانگریس کی غلامی کر رہے ہیں لیکن مجھے ایک
نوکری نہ دلا سکے۔ حالاں کہ اب تو کانگریس
کی وزارت بھی بن گئی ہے۔" [1]

اسرار میاں کا کردار ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اسرار میاں کی زندگی ایک ایسی ٹریجڈی ہے جو ہمارے

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۱۳۱

پورے سماج کا المیہ ہے۔ اسرار میاں نے اپنی شرافت اور ایثار کا پورا پورا ثبوت دیا لیکن وہ ہمیشہ دادا میاں کی ... دانستہ ... کی اولاد ہی کہلائے۔ یہ دنیا ان کے لیے میدان حشر بنی رہی۔ گھر میں ان کے ساتھ کتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا رہا۔ انھیں بیٹھک سے آگے جانے کی اجازت نہیں وہیں سے ہوک سے بلبلا کر چائے اور کھانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور کرمن بوا کی کڑوی کسیلی باتیں سنتے ہیں ان کے ادھورے جملوں سے ان کی بے بسی اور محرومی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"کرمن بوا اگر سب نے چائے پی لی ہو تو ....."[1]

اسرار میاں کے یہ ادھورے جملے جاگیردارانہ نظام پر ایک گہرے طنز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صفدر کا کردار اس ناول میں قابل توجہ ہے وہ سلمیٰ پوپی اور ایک مزدور کی شادی کی نشانی ہے۔ یہ حساس طبع ہے عالیہ کی بڑی بہن ثمینہ سے عشق کرتا ہے لیکن ایک مزدور کا لڑکا ہونے کی وجہ سے عالیہ کی ماں شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عالیہ کے باپ صفدر

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۲۶۸

کو مزید تعلیم کے لیے علی گڈھ بھیج دیتے ہیں جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم رکن بن جاتا ہے تحریک آزادی میں حصہ لیتا ہے قیام پاکستان کے بعد پاکستان چلا جاتا ہے اور اپنے تمام خیالات کو بدل کر امپورٹ ایکسپورٹ کے چکر میں کار اور کوٹھی کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ لاہور میں عالیہ سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ چچی سے اپنے رشتے کی بات کرتا ہے۔ شروع میں تو عالیہ رضامند ہو جاتی ہے جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفدر اب وہ صفدر نہیں رہا جس کے خیالات اور جذبات کی لتھینہ قدر کرتی تھی جس کی خاطر اس نے افیون کھا کر خودکشی کی تھی تو وہ اسے ٹھکرا دیتی ہے۔

جمیل بڑے چچا کے بڑے لڑکے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں اور مسلم لیگی نظریے کے حامی ہیں۔ عالیہ سے عشق کرتے ہیں لیکن اسے اپنا نہیں سکے۔ مسلم لیگی ہونے کے باوجود قیام پاکستان کے بعد پاکستان جانا پسند نہیں کرتے۔ آخر میں چھمی سے شادی کر لیتے ہیں۔

شکیل بڑے چچا کا چھوٹا لڑکا ہے جو باپ کی بے توجہی کے سبب آوارہ ہو جاتا ہے۔ یہ کردار زوال پذیر جاگیردارانہ نظام

کے ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو خاندانی بکھراؤ کی وجہ سے تعلیم
کے مواقع حاصل نہیں کر سکے ۔

ان کرداروں کے علاوہ آنگن کے دو کردار سب
سے اہم ہیں عالیہ اور چھمّی ۔ چھمّی کا کردار بہت جاندار ہے وہ حالات
سے مجبور ہو کر چڑچڑی اور بدمزاج ہو جاتی ہے گھر میں کسی کی پرواہ
نہیں کرتی ہر حال میں مگن رہتی ہے ۔ انتہائی منہ پھٹ ہے ۔ بڑے چچا
کے گھر میں پرورش پا رہی ہے ۔ چھمّی کے والد نے دو تین شادیاں کی ہیں
اس وجہ سے چھمّی ان سے نفرت کرتی ہے کیوں کہ وہ اولاد کی صحیح
تربیت اور کفالت نہیں کر پاتے ۔ جب وہ عید کے کپڑے بنوانے کے
لیے صرف پانچ روپے بھیجتے ہیں تو چھمی کہتی ہے

"اتنے روپیوں میں ہمارے ابّا کی شیری
بیوی صاحب کا کفن تک نہ آئے گا جانے
لوگ اتنے بچے کیوں پیدا کرتے ہیں اس سے
تو کتے کے پلّے پال لیں ۔" [1]

وہ کٹر مسلم لیگی ہے کسی کی پرواہ کیے بغیر گھر میں جلسے کرتی ہے

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۱۶۱

اور کانگریس کو برا بھلا کہتی ہے۔ بڑے چچا کانگریسی ہیں اس لیے گاندھی جی اور نہرو جی کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ لیکن چھمی اتنی نڈر ہے کہ گھر میں محلے کے بچوں کو جمع کر کے مسلم لیگ کا جلسہ کرتی ہے اور بچوں کے ساتھ گاتی ہے

"کاشی میں تلسی تو بولی بکریاں سب چر گیا
گاندھی کا ماتم کرو ہندو کی نانی مر گئی"

اور پھر نعرے لگاتی ہے

"مسلم لیگ زندہ باد۔ بن کے رہے گا پاکستان
دھنیا راج نہیں چلے گا، جنیا راج نہیں ہوگا۔"

غرض کہ چھمی کا کردار منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے اس میں فراست کے جذبات بھی ہیں محبت کے ساتھ حسد کا مادہ بھی ہے لیکن وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے اس کے جذبات کو سمجھنے والا اس کو سہارا دینے والا کوئی نہیں ملتا۔ ان ہی نزاکتوں نے اس کے کردار کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

اس ناول کا اہم اور مرکزی کردار عالیہ کا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں

"یہ نہ تو ممتن کی طرح آزاد ہے اور نہ درخشندہ
کی طرح انٹلکچوئل۔ وہ ایک گریلو لڑکی ہے جو
خدیجہ مستور کی سیدھی سادی کردار نگاری کا بہترین
نمونہ ہے" [1]

عالیہ مشرقی طرز کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور اپنے سماج اور معاشرے سے اچھی طرح واقف ہے۔ اپنے سماج اور معاشرے میں تبدیلی کی خواہاں ہے لیکن بغاوت کی ہمت نہیں ہے۔ وہ ایک مشرقی لڑکی کی طرح محبت بھی کرتی ہے لیکن اس کا عشق سماجی روایات سے باہر نہیں جانے پاتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے وجود کا احساس بھی ہے۔ باوجود سماجی پابندیوں کے اپنے اندر اتنی طاقت ضرور رکھتی ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف کسی بھی رشتے کو ٹھکرا سکتی ہے۔

خدیجہ مستور نے ناول میں جس تہذیب کو پیش کیا ہے عالیہ اس تہذیب کی تماشہ کردار ہے۔ اسے خاندان کی عزت کا احساس ہے۔ باپ کا احترام کرتی ہے ماں کا لحاظ رکھتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر جاتی ہے۔ لاہور میں صفدر سے ملاقات

---

[1] آنگن تبصرہ محمد احسن فاروقی۔ قومی زبان کراچی۔ اپریل ۱۹۶۴ ص ۲۰

ہو تی ہے یہاں اس کا کردار ارتقاء کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ صفدر
کی حمایت میں اپنی ماں کے مقابلے میں آ کھڑی ہو جاتی ہے جب کہ
ہتھینہ ماں کی مخالفت کی وجہ سے خودکشی کر چکی تھی۔ ماں سے کہتی ہے

"یہ نہیں جائیں گے ماں۔ میں نے فیصلہ
کر لیا ہے اب یہ ہمیشہ میرے پاس رہیں
گے ہم دونوں کو ایک کر دیجیے۔" [1]

لیلیٰ عالیہ کا کردار ارتقاء کی تمام ملبنہ یوں کو چھو لیتا ہے۔ یہ
کردار ترقی کرتے ہوئے بغاوت کے درجہ کو پہنچ کر اور آگے بڑھتا
ہے یعنی وہ صفدر سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے کیوں کہ
وہ محسوس کرتی ہے کہ صفدر وہ صفدر نہیں رہا جس کے لیے ہتھینہ
نے خودکشی کی تھی اور اس نے اپنی ماں سے بغاوت کی۔ لیلیٰ اور
عالیہ اس ناول کے دو اہم ترین کردار ہیں دراصل یہ دو سمتیں
ہیں جن سے ہم معاشرے کی وسعت اور حدود کے علاوہ آدمی کی
فطرت کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

"آنگن" میں آزادی اور تقسیم سے متعلق دو قسم

---

[1] "آنگن" خدیجہ مشہور ص ۲۹۹

کے نظریات ملتے ہیں۔ پہلا نظریہ تو بڑے چچا کا ہے کہ ملک
بغیر تقسیم کے آزاد ہو جس سے ملک اور سماج کی ترقی کی جا سکے۔
ہندوستانی حکومت قائم ہوگی تو سماج سدھار کے لیے کچھ ڑے
ہوئے اور کمزور طبقوں کو امداد فراہم کرے گی۔ اس کے برخلاف
دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم تو یقینی ہے لیکن ہجرت کا مسئلہ
درپیش نہیں ہوگا۔ پاکستان کے ہندو پاکستان میں رہیں اور ہندوستان
کے مسلمان ہندوستان میں۔ بڑے چچا کے گھر میں اس مسئلہ پر
اس طرح گفتگو ہوتی ہے۔

"تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا رہے
ہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا۔ واہ اس کی کیا
ضرورت پڑے گی جو جہاں ہے وہیں رہے
گا۔ مگر ہندو ہمیں کیوں رہنے دیں گے، وہ
ہمیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔ ان کے ہندو
جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے
کب کہیں گے کہ جاؤ۔" [1]

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۱۶۵

دراصل عام لوگوں کو مطالبہ پاکستان سے مطلب نہ تھا لیکن کچھ ایسے
لوگ تھے جو اقتدار حاصل کرنے کے لیئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے
اقتدار انہیں نئے ملک میں ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ ملازمت پیشہ
لوگوں کو توقع تھی کہ نئے ملک میں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکیں
گے۔ چناں چہ ملک کی تقسیم ہوئی۔ ہجرت کا مسئلہ درپیش ہوا۔
پاکستان کے علاقہ سے ہندوؤں اور ہندوستان کے علاقہ سے
مسلمانوں کو ہجرت کرنا پڑا۔ بڑے پیمانہ پر فسادات ہوئے
بڑے چچا کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح کا فساد ہوگا۔
"پاکستان بن گیا۔ لیگی رہنما کراچی جا چکے
تھے پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی
تھی۔ بڑے چچا اس صدمہ سے جیسے نڈھال
ہو گئے تھے بیٹھک میں بیماروں کی طرح
وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے یہ کیا ہو رہا
ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک
دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے
ہو گئے؟ یہ انہیں کس نے سکھایا؟ ان کے دل

سے کس نے محبت چھین لی؟ وہ بھی کیا زمانہ
تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ
آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور
مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان
نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا تھا
ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں پر
اب کیا رہ گیا دونوں کے ہاتھوں میں خنجر اٹھا۔" [1]

یوں تو قیام پاکستان اور فسادات کے سلسلے میں متعدد ادیبوں نے لکھا ہے لیکن خدیجہ مستور نے اس گوشہ کو بھی پیش کیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کس طرح چالاکی اور مکاری سے وہاں کے لوگوں کی جائداد پر قبضہ کیا گیا اور کس طرح ان کے مال و اسباب کو اپنی ملکیت میں شامل کیا گیا۔

"پانچویں دن ساموں نے ایک چھوٹی سی
کولی کا تالا توڑ کر اماں کو ان کے گھر جانے
پر مجبور کر دیا۔ ..... ایک دن

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۳۰۴

ماموں اکیلے آئے تو انھوں نے بتایا کہ کوٹی
اماں کے نام الاٹ کرادی گئی اب اسے کسی
بھی صورت میں نہ چھوڑنا۔ پھر انھوں نے فرنیچر
وغیرہ کی چند رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے
تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر سب کچھ
خریدا ہے اس کوٹی میں تو سب کباڑ بھرا ہوا ہے۔" [1]

کوٹی الاٹ ہونے پر عالیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کا حق کون لیے جارہا ہے۔ رسیدیں کہاں سے آگئیں اور یہ کوٹی کس طرح اس کی ہوگئی۔

خدیجہ مستور کو گھر کے ماحول پر پورا عبور حاصل ہے وہ ہر چیز پر گہری نظر رکھتی ہیں اسی وجہ سے آنگن ایک محدود دائرہ کی کہانی ہونے کے باوجود پورے برصغیر کی کہانی بن گیا ہے۔ آزادی اور تقسیم ہند کے واقعات سیاسی حالات و نظریات۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی سرگرمیاں اور پھر قیام پاکستان یہ ایسے حقائق ہیں جو ہمارے معاشرے کا ایک لازمی

---

[1] "آنگن" خدیجہ مستور ص ۳۱۹-۳۲۰

جزو بن گئے ہیں جن کو ہماری قوم کبھی بھلا نہیں سکتی ۔

ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں

" آنگن میں اشاراتی فن کو برتنے کی
بے مثل مثال ہے اس کا نام آنگن پورے
طور پر اشاراتی نام ہے ۔ جس ماحول سے
یہ ناول سروکار رکھتی ہے وہاں جغرافیائی
وجود سے گھر کا سب سے اہم حصہ آنگن ہی
ہوتا ہے " [1]

انھوں نے اپنے ناول " زمین " میں پاکستان میں بے
سہارا مہاجر لڑکیوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے ۔ ناول کا آغاز
پاکستان میں مہاجرین کے کیمپ سے ہوتا ہے ۔ ساجدہ اس ناول
کا مرکزی کردار ہے ۔ یہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے مہاجرین کے کیمپ میں
باپ کا انتقال ہونے کی وجہ سے بے سہارا ہو جاتی ہے ۔ ناظم اسے
اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے ۔ ناظم پاکستان
کا حامی ہے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے اس سلسلے میں اسے جیل

---

[1] " آنگن " تبصرہ ڈاکٹر احسن فاروقی فنون لاہور مئی جون ۱۹۶۵ء
ص ۲۶۱

بھی جانا پڑتا ہے لیکن آخر میں پاکستانی نظام سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

"انھیں تو یہ بر اگتا تھا کہ میں پاکستان کو
ایک مثالی ملک بنانے کا خواب دیکھتا ہوں
اور اس کی بقاء اور ترقی کا حامی ہوں انھیں
ان باتوں میں سازش کی بو آتی تھی اور وہ
سازش کا پتہ چلانا چاہتے تھے..... جب
میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں بھی ان کی
طرح پاکستان کو من و سلوا سمجھ کر کھا جاؤں
گا تو مجھ پر جو عذاب ابھی نازل ہونا تھا
وہ ختم کر دیئے گئے اور میں رہا ہو گیا"۔ [1]

پاکستان کے قیام میں اقتدار کی ہوس رکھنے والے اور زمینداروں کا اہم رول رہا ہے۔ چناں چہ پاکستان میں زمینداری کے خلاف ہر جمہوری تحریک کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ ناظم جب تک جمہوریت الفاف اور مساوات کا قائل رہتا ہے جیل میں رکھا جاتا ہے جب وہ ان اصولوں سے ہٹ جاتا ہے تو رہائی مل جاتی ہے۔ اس کردار کے

---

[1] "زمین" خدیجہ مستور ص ۲۵۸

ذریعہ خدیجہ مستور نے پاکستانی حکومت کی پالیسی اور جمہوری
تحریکوں میں حصہ لینے والے لوگوں کی حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے۔
تقسیم کے بعد پاکستان میں مہاجرین کے مسائل اور پاکستانی
نظام کی بدانتظامی پر بھی اس ناول میں تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔
ناظم کی اس گفتگو سے پاکستان میں رشوت خوری کا اندازہ لگایا
جاسکتا ہے۔

"تو آپ سن لیجیے میں نے یہ نوکری اس
لیے چھوڑی کہ اتنی چکربازی، اتنی بے ایمانی
اتنی رشوت، اتنی کمینگی، اگر میں وہاں
رہتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔۔۔۔۔۔ میں
ایسی گھسیانی نوکری نہیں کرتا۔۔۔۔۔ کیا روگے
ہیں وہی جو تم سے پہلے آنے والے کر رہے ہیں یا
اس سے کچھ زیادہ۔ مگر یہ یاد رکھو کہ اس نظام
کو تم لوگ بہت دن سہارا نہ دے سکو گے۔" [1]

آزادی کے بعد ہندوستان میں تو زمینداری کا خاتمہ کر دیا گیا لیکن

---

[1] "زمین" خدیجہ مستور ص ۱۰۱

پاکستان میں نئے نئے جاگیردار پیدا ہوئے ۔

"میں سرگودھے میں رہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہاں میری بہت سی زمین ہے دس مربعوں

میں تو صرف باغ ہے ۔ بڑے اچھے مالٹے ہیں

میرے باغ کے خاص ریڈ بلڈ ۔ میری بیوی

کو بھی جہیز میں پچیس مربع ملے ہیں ہم

دونوں اپنے علاقے کے سب سے بڑے

زمیندار ہیں سارے افسر ہمارے یہاں

آکر ٹھہرتے ہیں ۔" [1]

ناول میں تابی کا کردار مظلوم عورتوں کا نمائندہ کردار ہے ۔ تابی بھی مہاجر کیمپ کی بے سہارا لڑکی ہے جسے ناظم اپنے گھر لاکر نوکرانی بنا لیتا ہے اور ناظم اس کی اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اس وجہ سے اس کی جان چلی جاتی ہے ۔ تابی کی ماں نے ہندوستان میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد غیر برادری میں شادی کر لی تھی اور تابی کو پاکستان آنے والے قافلے کے ساتھ کر دیا تھا ساتھ ہی یہ ہدایت بھی

---

[1] "زمین" خدیجہ مستور ص ۲۳۶

کی تھی کہ کوئی اچھا ہاتھ پکڑ لیتا۔ جو اسے آخری دم تک بھی نصیب نہ ہوا۔ تابی کی کہانی ان مظلوم و بے بس عورتوں کی کہانی ہے جن کا پاکستان کے اعلیٰ طبقے نے استحصال کیا۔

# آبلہ پا

رضیہ فصیح احمد

آدم جی انعام یافتہ یہ ناول قیام پاکستان کے بعد
لکھے گئے ان ناولوں میں سے ایک ہے جن میں واقعات کے مقابلے
میں کرداروں کو اہمیت دی گئی ہے ۔ ناول کا زیادہ تر حصہ کردار
کی آپ بیتی پر مشتمل ہے ۔

ناول کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ بوبی امریکہ میں
اسد کی اخلاقی غلطی کا ثمر ہے ۔ صبا بوبی کی معصومیت اور شرارت
سے متاثر ہو کر اس کے قریب آجاتی ہے بالآخر اسد اور صبا شادی کے
بندھن میں بندھ جاتے ہیں لیکن جلد ہی دونوں کو یہ احساس ہو جاتا ہے
کہ دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے ۔ صبا سنجیدہ اور متین طبیعت
کی مالک ہے جب کہ اسد کے مزاج میں نمائشی عنصر بہت زیادہ ہے ۔
اسد شادی کے بعد صبا کو اپنے آبائی گھر میں اس لیے نہیں لاتا کہ اس کے
والدین غریب ہیں لیکن ایک دن صبا جب اپنی سسرال جاتی ہے تو
اسے حقیقت کا احساس ہوتا ہے اور اس بناء پر اس کے دل میں
اسد کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ رفتہ رفتہ یہ خلیج بڑھتی
جاتی ہے اور اسد روبینہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ وہ صبا کو طلاق دے

کر روبینہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن روبینہ عین وقت پر انکار کر دیتی ہے ۔ اسی کشمکش اور ذہنی انتشار کے دوران اسد کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ بوبی جسے وہ اپنا لڑکا سمجھتا تھا اور بے حد چاہتا تھا وہ اس کا بیٹا نہیں بلکہ اس کے دوست اصغر کا بیٹا ہے تو وہ جنونی کیفیت میں بوبی کو قتل کر دیتا ہے اور گرفتاری کے بعد اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف کر لیتا ہے ۔

ان ہی واقعات کے سہارے "آبلہ پا" کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے ۔ صبا اور اسد کے کرداروں سے کہانی کی ابتداء کی گئی ہے اور پھر ان کی یادوں کے سہارے ان کے ماضی کو نمایاں کیا ہے ۔ صبا اور اسد اس ناول کے مرکزی کردار ہیں ۔ اسد جدید روشنی کا ہے اس کے لیئے دولت اور عیش و عشرت بہت اہمیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے والدین کو بھی اپنا نہیں کہتا کیوں کہ وہ غریب ہیں جس کی وجہ سے سوسائیٹی میں اس کی عزت کم ہو جائے گی ۔

صبا مشرقی لڑکی کے مثالی تصور کو پیش کرتی ہے ۔ وہ ایک سنجیدہ تعلیم یافتہ اور مطالعے کی شوقین لڑکی کے روپ

میں ہمارے سامنے آتی ہے جس کو ہوٹل، کلب، پکنک وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ صبا کے کردار کی بلندی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی شادی کی پہلی رات کو اپنے بچپن اور خاندان کے سارے حالات اور واقعات اسد کو سناتی ہے۔ صبا کا کردار ناول کی رفتار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا جاتا ہے صبا کے کردار کے مختلف پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ناول کے ابتدائی حصہ میں ناول نگار نے صبا کے اصل روپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

"میں ابھی پینٹنگ نہیں کر سکتی، لکھ نہیں سکتی صرف کاڑھ اور بُن سکتی ہوں اور جب کوئی چیز شروع کرتی ہوں تو مجھے اس کو ختم کرنے کا اتنا ہی شوق ہوتا ہے جتنا کسی مصور یا افسانہ نگار کو اپنی تخلیق ختم کرنے کا۔" [1]

اسد کے عادات و اطوار اور خیالات صبا سے بالکل برعکس ہیں۔ اسد کے مزاج میں زندگی کی حقیقتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۲۳-۲۴

نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس بری طرح فیشن ایبل سوسائیٹی کا گرویدہ بنالیتا ہے کہ خود اس کے کام کرنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں اور وہ صرف وہی پسند کرتا ہے جو کلب کے ممبر اور فیشن ایبل سوسائیٹی چاہتی ہے۔ نتیجہ میں وہ ایک گمراہ انسان بن جاتا ہے۔ بوبی کے قتل کے بعد اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے وہ کہتا ہے

"کالج میں ہمیشہ امیر ترین لڑکوں میں رہا
اور خود کو متمول ظاہر کرتا رہا لباس اور
بات چیت میں ہمیشہ اعلیٰ طبقہ کو نظر میں
رکھا خیالات بھی انھیں کے اپناتے رہا یہاں تک
کہ بعد میں خود کو قطعی ان میں سے سمجھنے لگا ان
لوگوں کے خیالات مجھے اپنے خیالات نظر آنے
لگے اور اپنے گھر کی بہت سی باتوں میں مجھے جہاں
معلوم ہونے لگی رفتہ رفتہ میں اپنے گھر سے کٹنے
لگا۔ چھٹیوں میں گھر جانے کے بجائے میں امیر
لڑکوں کے ساتھ سیر و سیاحت پر نکل جاتا۔" [1]

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۱۳۴

در حقیقت اسد کا کردار صبا کے کردار کی ضد ہے۔ اسد اور صبا کے درمیان کی کڑی روبینہ ہے جو صبا کے والد کے دوست کی لڑکی ہے جو نہ تو اسد سے محبت کرتی ہے اور نہ ہی عامر سے۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد صرف دولت حاصل کرنا اور عیش پرستی ہے۔ وہ سوسائیٹی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے اور سوسائیٹی میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیئے بہت کچھ جتن کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کے کردار میں تصنع اور مبالغہ آرائی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اچھے اور برے کی تمیز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ناول نگار نے روبینہ کے کردار کے ذریعہ سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو سوسائیٹی میں ہزاروں برائیوں کی جڑ بنے ہوئے ہیں اور سوسائیٹی سے جونک کی طرح چپٹے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ ناول کے دوسرے کردار عذرا، عامر امجد، شمس باجی کے کردار زندگی کے حقیقی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وزیر آغا نے "آبلہ پا" پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"رضیہ فصیح احمد نے صرف ایک ناول نگار کے فرائض انجام نہیں دیئے ہیں بلکہ ایک

سوچتی، سلگتی اور تڑپتی ہوئی شخصیت پر سے
نقاب اٹھایا ہے۔ اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ
اس ناول کا ہر کردار خود اپنی زبان سے اپنے
خیالات و تاثرات کو پیش کرتا ہے جس سے
ناول بہت جاندار اور فلسفہ حیات کا بہترین
نمونہ بن جاتا ہے۔" [1]

"آبلہ پا" ایک سماجی ناول ہے جس میں سماج اپنی تمام تر رنگینوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ واقعات کی تفصیل سماج کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ سماجی ناولوں کے بارے میں رالف فاکس کہتا ہے

"سماجی رجحان کے ناول اپنے مقصد کو مکمل طور
پر اس وقت بروئے کار لاتے ہیں جب وہ سماج کے
حقیقی رشتوں کو بیان کرتے ہیں۔" [2]

ناول میں تقسیم ہند کے اثرات واضح طور پر تو نہیں ملتے لیکن ناول کا وہ حصہ جہاں صبا شادی کی رات اپنی زندگی کے واقعات سناتی ہے

---

[1] "آبلہ پا" تبصرہ وزیر آغا فنون لاہور اکتوبر نومبر ۱۹۷۲

[2] The Novel & The People: RALF FOX p. 63

تو تقسیم کا واقعہ یاد بن کر ابھرتا ہے۔

"جنگ ختم ہونے کے بعد آزادی کی جدوجہد
نے وہ تیزی پکڑی کہ سانس لینے کی مہلت نہ
ملی۔ نعرے، تقریریں، جلسے، مناد عام
ہو گئے۔ اسکول میں مسلمان اور ہندو لڑکیوں
کے درمیان تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف
آزادی کی امید کے ساتھ آپس میں پھیلے ہوئے
عدم اعتماد کی وجہ سے بے چینی بڑھ رہی تھی۔" [1]

"بابا کو ہر وقت یہ فکر کہ اس بھرے پرے
کنبے کو لے کر کسی طرح پاکستان نکل جاؤں
وہ ہر وقت نقشہ لیے بیٹھے یہی سوچتے رہتے
کہ کس طرح، کس راستے سے صحیح سلامت
پہنچیں۔ ایک طرف پٹیالے میں قتل و غارت
کا بازار گرم تھا تو دوسری طرف دہلی اور
لکھنؤ پور ہندوؤں اور سکھوں سے گھرے

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۱۳۲

ہوئے مکان کو چھوڑ کر وہ ایک مسلمان
کے محلے میں چلے آئے تھے۔ بیماریاں کی فضاء
بھی دن بہ دن خراب ہو رہی تھی اس لیئے
انھوں نے کانپور الہ آباد کے راستے بمبئی
اور وہاں سے بذریعہ جہاز کراچی جانے کی
سوچی۔ اس وقت تک یہی محفوظ ترین
راستہ تھا لیکن ان کی قسمت سے یہ راستہ
بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دفعتاً صبا کی
آواز رندھ گئی اور اس نے دونوں
ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔" [1]

یہاں صبا کی یادداشت کے سہارے تقسیم ہند کے فسادات کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف زندگی کی تمنا کر رہے تھے لیکن موت کے ظالم ہاتھوں سے بچ نہ سکے۔

صبا کے بابا کی ڈائری کے اوراق میں بھی تقسیم کی یاد محفوظ

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۱۳۳ - ۱۳۴

ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارا ہوا اور وہ
جنس جو قدرت کا سب سے بڑا ظلم تھی ایک
دم ارزاں ہو گئی۔ میں پہلے سے پاکستان کے
لیئے آپٹ کر چکا تھا اور ہر وقت وہاں پہنچنے
کے طریقوں اور راستوں پر غور کیا کرتا تھا
بہت سوچ بچار کے بعد میں نے سب سے لمبا
اور سب سے محفوظ راستہ طے کیا۔ یہ تھا بمبئی
پہنچ کر بذریعہ جہاز کراچی جانے کا تھا جب
تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں اور ہم رخصت
ہونے لگے تو یکایک صبا بیمار ہو گئی مگر
یہ وقت نہیں تھا جب بچوں کی چھوٹی موٹی
بیماریاں سفر کو ملتوی کر دیتی ہیں یہ زندگی
اور موت کا سوال تھا اور اس وقت
بچ نکلنے کے لیئے موقع غنیمت تھا پھر جانے
کیا ہو۔ پہلے میں نے اپنا سامان ویگن میں بھر کر

پاکستان روانہ کر دیا یعنی اسے ہمیشہ کے
لیئے خدا حافظ کہہ دیا ..... اور پھر خدا
کے بھروسے گاڑی میں آن بیٹھا اس گاڑی
میں یہاں سے وہاں تک نہتے مسلمان بھرے
ہوئے تھے۔ گاڑی یوں گھسا گھس تھی کہ
سانس لینا بھی دشوار تھا ..... اتنے
آدمیوں کی سانس کی گرمی، پسینے کی بو،
حبس اور بھوک صبا زیادہ برداشت نہ
کر سکی اور بے ہوش ہو کر دھڑ سے فرش
پر گری۔ ..... میں نے صبا کو فرش
پر لٹا کر اس پر ہلکی سی ایک چادر ڈال
دی اور پنکھا جھلنے لگا۔ اس وقت مجھے
اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا میں اس کے
لیئے کچھ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ اس رنج و بے
بسی کے عالم میں کچھ دیر کو میں اس برے
خطرے کو بھول گیا جس میں ہم سب کی جانیں

کو خطرہ لاحق تھا۔ دوبارہ مجھے اس خطرے
کا احساس اس وقت ہوا جب لوگوں کی چیخ
و پکار اور گولیوں کی سنسناہٹ نے ایک
لمحے قیامت کا سماں پیدا کر دیا۔ میں اسی
طرح فرش پر بیٹھے بیٹھے نیچے جھک گیا اور شانہ
ٹوٹی شاخوں کی طرح انسانوں کے اعضاء کی
اور خون کی بوچھار دیکھ کر بے ہوش ہو گیا
اور نہ جانے یہ کتنے عرصہ بعد کی بات ہے جب
یہ اچھی طرح میرے ذہن نشین ہوا کہ اس
بھرے پرے کنبے میں سے صرف ہماری دو
جانیں بچی ہیں میری اور صبا کی۔" [1]

ناول میں ایک اور موقع پر صاحب بھوک کے بارے میں کہتی ہے
تو تقسیم ہند کے وقت کا منظر اس کی نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

"جب ہم ہجوارے میں ہندوستان سے بھاگے
تھے آج تک میں بھوک کی وہ شدت ہیں

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۳۹۵ - ۳۹۶

بھولی ہوں جب واقعی انسان کا دل پایا
ہے کہ وہ کوڑا پائیر سمجھ کر چبا جائے، کچھ
کھالے، کہیں سے کچھ مل جائے جو وہ منہ میں
رکھ لے چاہے وہ زہر ہی کیوں نہ ہو مگر
کچھ نہیں ملتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں
میں سائے تھے جیسے وہ ماضی کے کھنڈروں
میں گھوم رہی ہو۔" [1]

یادِ ماضی (Nostelgia) ایک ایسا ذریعہ ہے جو انسان کے حال کو ماضی سے جوڑا رکھتا ہے۔ صبا کا بار بار اپنے بچپن کے اس حادثے کو یاد کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے ماضی کے ان چنچل و حسین خوابوں کو نہیں بھولی جس میں کہ اس کا بچپن گزرا تھا جس میں اس کے ساتھ ایک شفیق ہستی ماں کی تھی اور بھائی بہن تھے لیکن تقسیم نے ان سب کو جدا کر دیا۔ ان کو جدا ہو کر کئی برس بیت چکے ہیں لیکن وہ انھیں بھلا نہ سکی۔ تقسیم کے کرب کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے۔

---

[1] "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد ص ۳۲۴

# شکست کی آواز

# غبارِ شب

قاضی عبدالستار

انگریزوں نے ہندوستان میں نفاق کا جو بیج بویا تھا وہ تقسیم ہند کے روپ میں سامنے آیا۔ تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ہی قتل و خون اور فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کانگریس نے زمینداری کے خاتمے کا اعلان کیا اس کے ساتھ ہی اس تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ زمینداری کے خاتمے کا صرف زمینداروں پر ہی اثر نہیں پڑا بلکہ اس طبقے سے منسلک متوسط طبقہ اور نچلے طبقہ پر بھی اس کا اثر پڑا۔ زمینداری کا خاتمہ ہوتے ہی متوسط اور نچلا طبقہ جن کی زندگی کا دارومدار زمیندار پر تھا بے روزگار ہو گیا۔ آزاد ہندوستان کے سامنے بے روزگاری کا بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء سے زیادہ ۱۹۴۷ء میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ناول بھی یو۔ پی کے زمینداروں کی مٹتی ہوئی تہذیب کی دردناک کہانی ہے۔ اس میں چودھری نعمت رسول اور ان کے بھانجے جاوید کی زمینداری کے خاتمے کی داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے چودھری نعمت رسول لال پور کے جاگیر دار تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا اپنا گاؤں لال پور بھی نہ بچ سکا۔ جاوید لکھنؤ کے ایک معمولی تعلقہ دار تھے۔ عروج کے زمانے میں ماموں سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے لیکن جاگیرداری کے خاتمے کے بعد چودھری نعمت رسول نے اپنی بہن سے روابط شروع کیے۔ جاوید کے ذریعہ چودھری نعمت رسول کے رہن سہن کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف جاوید کے ماموں کی ذاتی زندگی کی کہانی ہے بلکہ اس عہد کے جاگیردار طبقہ کی تہذیب ہے جو جاگیرداری ختم ہونے کے بعد بھی اسی رنگ میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کے لیئے وہ ذرائع تلاش کرتا ہے وہ ذرائع یہ ہیں کرایہ کے لوگوں کو رکھ کر دوسرے جاگیرداروں کے یہاں ڈاکہ ڈالنا۔ گاؤں کا پردھان بننا۔ تھانہ کچہری سے رابطہ قائم کرنا وغیرہ۔ ان ذرائع کو تلاش کرنے میں ہندو مسلم زمیندار دونوں برابر کے شریک نظر آتے ہیں یعنی کہ زمینداری کے خاتمہ کا اثر دونوں پر یکساں پڑ رہا تھا۔ لگان اب جاگیرداروں کے ہاتھ نہیں آرہی تھی لیکن کسانوں پر اپنا اثر برقرار رکھنے کے لیئے وہ ان کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔

چودھری نعمت رسول کے یہاں سلم ڈاکو
دلاور خاں ڈاکہ ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ دوسرے ہندو جاگیرداروں
کو دھمکی دے کر اس نے کافی رقم اکٹھا کر لی تھی لیکن چودھری نعمت
رسول کے یہاں ڈاکہ ڈالنے میں وہ ناکام رہتا ہے۔ چودھری صاحب
کے آدمیوں نے اسے پکڑ کر چودھری صاحب کے سامنے پیش کیا۔
معمولی سزا کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا۔ زمینداروں اور تعلقداروں
کا مقبول مشغلہ شکار ہوا کرتا تھا۔ زمینداری کے خاتمے کے
بعد ہر جاگیردار پریشان تھا اب اس کے پاس وقت بھی ہیں
تھا اور اس کی شکارگاہ بھی اس کی نہیں رہی تھی۔ پہلے وہ تفریح
طبع کے لیے شکار کھیلنے جایا کرتا تھا اب وضع داری قائم رکھنے
کے لیئے۔ جاوید اس کے ماموں کا لڑکا ہے اور ایک نوکر تلک
سنگھ شکار میں جاتے ہیں کہ ان کو خبر ملتی ہے کہ ان کے ابو کا خاص
آدمی گنگا پرشاد مار دیا گیا ہے۔ ماموں پریشان تھے کہ ان
کے آدمی کو رام لال پانڈے نے مار دیا تھا جو ایک دوسرا جاگیردار
ہے۔ وہ یہ کام اپنا اثر قائم کرنے کے لیئے کرتا ہے۔ رام لال پانڈے
کو پکڑوانے کے لیئے چودھری صاحب تھانے جاتے ہیں اور

داروغہ جی کو رشوت قرض رشوت پیش کرتے ہیں اور رام لال پانڈے کو پکڑوا دیتے ہیں۔ یہ ناول کا پہلا حصہ ہے اس حصے میں جاگیردار اپنی کھوئی ہوئی ہستی اپنے اثر کو قائم کرنے کے لیے جو ذرائع استعمال کرتا ہے اور اپنی وفع داری کو برقرار رکھنے کے لیے جو جتن کرتا ہے اسے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے میں لکھنؤ کی عیش پرستارانہ تہذیب کا ذکر ملتا ہے جہاں عشق و عاشقی کے لیے سازگار ماحول ہے۔ ناول کے اس حصے میں چودھری صاحب کے گھر کے آدھے لوگ لکھنؤ منتقل ہو جاتے ہیں۔ جاوید لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ اس میں جاوید اور اجے کی داستان عشق ہے۔ جاوید پہلے سلیمٰی اعجاز مولوی گنج سے اور بعد میں اپیا سے عشق کرتا ہے۔ اپیا چودھری نعمت رسول کی بیٹی ہے۔

ناول کے تیسرے حصے میں جاگیرداروں، تعلقداروں کی تہذیب اپنا دم توڑ دیتی ہے۔ چودھری نعمت رسول کی زمینداری تو ختم ہو گئی تھی لیکن وہ اپنی حیثیت قائم رکھ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد مراثن سے شادی

کرلی۔ اور پہلی بیوی کے زیورات مراشنوں میں تقسیم ہوجاتے
ہیں۔ چودھری صاحب اور ان کی نئی بیوی کی عمر میں کافی فرق
ہے۔ چودھری صاحب رات نیرنشے میں رہتے ہیں۔ راجو جو
بھینس لگانے کے لیئے ملازم ہے رات چودھرائن کے پاس آتا ہے۔ جاوید
نوکرانی نشین سے دریافت کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ پہلے تلک سنگھ
آتا تھا اب راجو آتا ہے۔ اپیا جاوید کو بتاتی ہے کہ یہ میری ماں نہ
ہوکر ایک میراثن ہے اجے بھی اس سے بیزار ہے سمجھتا ہے لیکن
کچھ کر نہیں پاتا۔ ایک دن شراب پی کر رات کو جاگنے کا پروگرام
بنایا اسی رات گڑھی میں ڈاکہ پڑتا ہے اپیا اور ماموں کو چوٹیں
آتی ہیں اجے موقع غنیمت جان کر چودھرائن اور راجو کو گولی
مار دیتا ہے اور اپنا ایک آدمی تھانے اور دوسرا آدمی ٹھاکر
کنور وکرم راج سنگھ بٹروان کے یہاں بھیجتا ہے اور ان سے کہلواتا
ہے کہ ہمارے یہاں ڈاکے میں چودھرائن کے علاوہ ہمارا ایک
آدمی بھی لڑتا ہوا مارا گیا۔ چودھری صاحب اور بٹیا بے ہوش
ہوگئیں۔ ڈاکو ستر ہزار نقد اور زیور لے گئے۔ ٹھاکر بٹروان
نے ذمہ داری سنبھالی اچانک اجے نے دم توڑ دیا۔ لال پور کی

گڑھی اجڑ گئی ۔ چودھری نعمت رسول قرض دار ہیں انھیں اپیا کی
فکر ہے کہ اس کی شادی کہیں طے ہو جائے تو گڑھی نیلام کر کے
قرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔ قرض کے لیئے اپیا نے زیور ابو کو پیش
کیئے۔ گڑھی کا سامان قرض چکانے کے لیئے نیلام کیا جا رہا تھا کہ ٹھاکر
بزرواں تشریف لائے اور نقد و زیورات پیش کیئے ۔ چودھری
صاحب ٹھاکر صاحب سے کہتے ہیں کہ اب میں ہندوستان چھوڑ رہا ہوں
اپنے سالے سے جو ایس پی ہے ایک سفارشی خط دلوا دیجیئے ۔ پاکستان
جانے کی تیاری ہونے لگی ۔ چودھری صاحب گھبرائے ہوئے تھے ۔
بزرواں خط لینے کے لیئے گئے ۔ ٹھکرائن نے اپیا کو زیور پہنایا اور
نوٹوں کی گڈی پیش کی ۔ رات ہو چکی تھی اپیا اور جاوید ادھے میں
سوار ہوئے چودھری صاحب ہاتھی پر ۔ قافلہ چلا ۔ راستے میں
رام لال پانڈے اپنے آدمیوں کے ساتھ آکر چودھری صاحب کو
مار ڈالا ۔ ٹھاکر نے رام لال پانڈے کے گاؤں میں آگ لگوا دی
اور رام لال پانڈے کو بھی اسی آگ میں ڈال دیا ۔ گڑھی پر پولیس
لگ گئی ۔ تفتیش ہو رہی تھی ۔ اپیا کے ماموں جو کراچی میں لیفٹننٹ
کرنل تھے ان کا خط آیا کہ وہ بہت جلد آ رہے ہیں ۔ جاوید اپیا سے

اجازت لے کر امی اور ابا سے ملنے گھر آیا۔ اپیا نے زندگی بھر انتظار کرنے کا وعدہ کیا۔ جاوید کے بڑے بھائی سے اپیا کی شادی کی بات چل رہی تھی لیکن چودھری کی موت کے بعد شادی کے لیے ان کی طبیعت گوارا نہ کی۔ جاوید نے اپنا منشا ظاہر کیا جس پر کافی ہنگامے کے بعد ابا اور اماں دونوں رضامند ہو گئے۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی اپیا اپنے ماموں کے ساتھ پاکستان جا چکی تھی۔

اس ناول میں تین خاندانوں کو پیش کیا گیا ہے جس کے افراد اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ ہیں۔ پہلا خاندان چودھری نعمت رسول کا ہے جو لال پور گاؤں کے جاگیردار ہیں جس کے افراد اجے، اپیا اور چودھرائن ہیں۔ دوسرا جاوید کا خاندان ہے جاوید کی ماں، سوتیلا بڑا بھائی اور ایک بہن ہے۔ تیسرا خاندان اعجاز صاحب کا ہے جو سرکاری نوکری کرتے ہیں ان کی لڑکی سلیمٰی اعجاز ہے۔

جاوید ناول کا مرکزی کردار ہے جو ناول کے ہر حصے میں ہر جگہ اور ہر گھر میں موجود ہے۔ جاوید معمولی زمیندار گھرانے کا لڑکا ہے۔ زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اس کے گھر کی

مالی حالت خراب ہے کل چالیس بیگھے زمین ہے اس پر بڑے بھائی کاشت کرواتے ہیں اور اس کی آمدنی سے جاوید کو پڑھنے کے لیے روپے بھیجتے ہیں۔ جاوید آزاد ہندوستان کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے لیکن وہ تقسیم ہند کے بعد پیدا شدہ مسائل سے دوچار ہے نہ تو نوکری ملتی ہے اور نہ ہی اس کی شادی ہو پاتی ہے سلیٰ امجاز اس کی پہلی محبوبہ ہے جس کی شادی ایک مولوی سے ہو جاتی ہے۔ دوسری محبوبہ اپیا ہے جو جاوید کے لیے پہلا اور آخری خط چھوڑ کر پاکستان چلی جاتی ہے۔

اپیا اس ناول کا دوسرا اہم کردار ہے۔ اپیا چودھری نعمت رسول کی لڑکی ہے باپ کو لڑکی کی شادی کی فکر ہے لیکن شادی نہیں کر پاتے۔ جب جاوید مہمان بن کر آیا تو دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں لیکن ان کی شادی نہیں ہو پاتی گھر کی تباہی کے بعد اپیا پاکستان چلی جاتی ہے۔

ناول کا ایک اور اہم کردار اجے ہے۔ یہ نعمت رسول کا لڑکا ہے۔ ایک زمیندار کے لڑکے کی طرح اس کی پرورش ہوئی۔ بچپن میں ماں کا انتقال ہو گیا۔ ایک سوتیلی ماں

آتی ہے جو گھر کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ گھر کا سارا زیور اپنے رشتہ داروں میں بٹواتی ہے نوکروں سے ناجائز رشتے قائم کرتی ہے اجے موقع پاکر اسے ختم کردیتا ہے لیکن تب تک نعمت رسول کا گھر اجڑ چکا ہوتا ہے۔ اچانک اجے کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔

چودھری نعمت رسول لال پور کے بہت پرانے زمیندار تھے۔ آزادی کے بعد ان کی زمینداری ختم ہو گئی لیکن آخری وقت تک اپنی عزت قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ساری جائداد ختم ہو چکی تھی۔ قرض چکانا تھا۔ قرض اتنا تھا کہ مکان بیچنے پر بھی ادا نہ ہوتا۔ آخر میں پاکستان جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ ایک دوست ٹھاکر بٹر روان کے یہاں سفارشی خط لینے جاتے ہیں لوٹتے وقت رام لال پانڈے ان کا خاتمہ کردیتا ہے۔

قاضی صاحب نے اس ناول میں ان زمینداروں کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے جو آزادی کے بعد پاکستان نہیں گئے لیکن بالآخر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد بھی زمیندار اپنی آن بان برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے بہ ظاہر کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کہ زمینداری کے خاتمے کا ان

پر کچھ اثر پڑا ہے۔ چودھری نعمت رسول بھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شان بنی رہے۔ جاوید کے بھائی جاوید سے دریافت کرتے ہیں تو جاوید ان کی حقیقت اس طرح بیان کرتا ہے۔

"یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا علاقہ چھن گیا ہے ..... وہی آن بان وہی مصارف ..... ماموں مومانی، ابے سب لوگ بہت با اخلاق اور بہت پیر محبت ہیں ..... ہاتھی واقعی بک گئے ہیں کہ ابھی ہیں؟ جی دونوں ہیں۔" [1]

یہ ظاہری آن بان زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکی۔ آمدنی کے سارے ذرائع بند ہو چکے تھے۔ فضول خرچی اور پرانی روایت کو برقرار رکھنا جاری تھا ان وجوہات کی بنا پر بہت جلد یہ خاندان مالی دشواریوں کا شکار ہو گیا۔

"اب کیا رہ گیا ہے اس گڑھی میں۔ لوٹے پھوٹے دو چار چاندی کے برتن، دقیانوسی

---

[1] "شکست کی آواز"، قاضی عبدالستار ص ۷۸ - ۷۹

زیور، گلاسنڈ، فرنیچر، ہاتھیوں کی روپہلی
الماریاں، گھوڑوں کے سنہرے زیور میری
آنکھوں کے سامنے ان کے سگوں کے کلیجے میں
گھس گئے مگر میں اف تک نہ کر سکی۔ خدا کی
قسم جاوید ..... زمینداری فیل ہونے
سے قبل ہر سال اس عورت کا کوئی نہ کوئی
زیور بنتا تھا ..... اور دوسرے سال
پتہ نہ چلتا تھا کہ کیا ہو گیا ابو کی ساری تباہی
کی ذمہ داری یہی حرافہ ہے .....
وہ نشے میں بدمست پڑے رہتے اور یہ
دونوں ہاتھوں سے گڑھی لٹاتی رہی۔
اجے کی عیاشیاں اس کے کرتوتوں کا
نتیجہ ہیں"۔ [1]

یہ چودھری نعمت رسول کی دوسری بیوی کی کہانی ہے جس سے
زمینداری کی تباہی و بربادی کی وجہ نمایاں ہوتی ہے۔ قاضی صاحب

---

[1] "شکست کی آواز" قاضی عبدالستار ص ۱۷۴-۱۷۵

نے ان کی بربادی کا اصل سبب بڑی جرأت اور بے باکی سے بیان کر دیا ہے کہ زمیندار اپنے آخری دنوں میں شراب کے نشے میں رہتے اور عیاشی ان کا خاص شغل تھا۔ بڑا زمیندار اپنی زمین پر کاشت بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نئے قانون کے مطابق جو اس زمین پر کاشت کرے گا وہ اسی کی ہو جائے گی۔ چودھری نعمت رسول کو افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں نے اپنی زمین پر قرض نہیں لیا اگر زمین پر قرض ہوتا تو زمین نیلام ہو کر قرض ادا ہو جاتا۔

زمینداری کے خاتمے سے جائداد تو اپنے آپ ختم ہو گئی لواب نعمت رسول پر بیالیس ہزار کا قرض باقی رہا۔ قرض کی ادائی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ نقدی اور زیورات سب ختم ہو چکے تھے۔ اب انھیں صرف پاکستان ہی نجات کا ذریعہ نظر آ رہا تھا کیوں کہ ابھی تک اس وطن میں جاگیردار کی زندگی گزاری تھی اب معمولی انسان کی طرح رہنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے اپنا وطن چھوڑنا گوارا کیا۔

تقسیم ہند نے مسلم زمینداروں کے لیے دوسرے وطن کی راہ کھول دی لیکن ہندو زمیندار کہاں جاتے۔ ان کی

اپنے ہی ملک میں اپنی عزت برقرار رکھنا تھی اور وہ چھوٹے
زمیندار بھی جو اپنی زمین پر کاشت کرنے لگے تھے انھوں نے اپنے
وطن ہی میں رہنا پسند کیا۔ ان پر زمینداری کے مسائل کے ساتھ ساتھ
آزاد ہندوستان کے دوسرے مسائل بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جاوید
جو ایک معمولی تعلقہ دار گھرانے کا فرد تھا اس کے بعد اپنی جائداد پر
کاشت کرواتے ہیں اگر وہ زمین پر کاشت نہیں کرتے تو کھیت
نکل جاتے۔

"اس طرف جوار میں جانوروں کا ہیضہ چلا
ہے ..... میرے پانچ بیل ابھی کل ہی
پیر موں تک مر گئے ..... خریف کی
ساری فصل برباد ہے۔ بیسارہ واپس آجائے
تو خدا کا شکر ادا کروں اور ادھر کا پورا پک
پالے میں سیاہ ہو گیا میں نے ادھر اور ماش
سے بڑی امیدیں لگا رکھی تھیں اب سر دست
سب سے بڑی مصیبت بیلوں کی ہے اگر ابھی
خریدنا ہوں تو فاقوں کی نوبت آئے

ہے اور کھیت اگ نہ پائیں گے ادھر چند
ہفتوں سے مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ زمینداری
فیل ہو گئی۔" [1]

اس اقتباس سے ہندوستان کی کاشت کاری کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندوستان میں کھیتی کی ساری ذمہ داری خود کسان پر تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ اگر بارش نہ ہوئی تو کھیتی کی بربادی لازمی تھی۔ سردیوں میں پالا پڑنے سے خریف کی فصل برباد ہو جاتی۔ ملک کی ترقی کے لیے پیداوار بڑھانے کے لیے اب حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان مسائل کی طرف دھیان دے۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے جاگیر دار کو صرف لگان سے مطلب تھا انھیں کسی بھی حال میں لگان ملنا چاہیے خواہ ان کی ریاست میں قحط پڑے سیلاب آجائے یا پوری فصل پر پالا پڑے۔ لیکن اب زمینداروں کو بھی کاشتکاری کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لیے ناول نگار نے کھیتی کے مسائل کو زمیندار کی زبان سے بیان کیا ہے۔

---

[1] "شکست کی آواز" قاضی عبدالستار ص ۱۴۷

۱۹۴۷ء سے قبل ہی ہندوستان میں جدید تعلیم
کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ بے روزگاری کا شکار ہو رہا تھا
زمینداروں کے یہاں ان لوگوں کو نوکریاں مل جاتی تھیں لیکن
زمینداری ختم ہو جانے سے اب زمیندار کے لڑکے بھی بے کار
ہو گئے تھے انھیں بھی نوکری تلاش کرنی پڑی۔ آزاد ہندوستان میں
بے روزگاری کا مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا اس مسئلے کو ناول میں
اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"اپنی بے کاری کا اسے بڑا غم ہے مگر کیا کرے
نوکریاں تو مولیٰ جیسے عنقا ہو گئیں.....
اس ہندو حکومت میں کون پوچھتا ہے ہم لوگوں
کو ورنہ اب تک تو ڈپٹی ہو گیا ہوتا میر لال۔
انگریزوں کے وقت معلوم نہیں تمہاری اس
گڑھی میں کتنے آئے اور تحصیل دار ڈپٹی ہو کر گئے۔"[1]

آزادی کے بعد ہندوستان کے تعلیمی نظام میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔
اتر پردیش کے مدرسوں سے اردو کو نکال کر ہندی کو ذریعہ تعلیم

---

[1] "شکست کی آواز" قاضی عبدالستار ص ۲۹

قرار دیا گیا۔ اس نکتے کو ناول میں بہت بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جاوید کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم ہے اس کی ابتدائی تعلیم آزادی سے پہلے ہوئی ہے وہ ہندی سے ناواقف ہے لیکن اس کی چھوٹی بہن جس کی ابتدائی تعلیم آزادی کے بعد شروع ہوتی ہے وہ اپنے بھائی جاوید کے پاس خط بھیجتی ہے جو ہندی میں لکھا ہے جاوید خود نہیں پڑھ پاتا کسی اور سے پڑھواتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے سارے مسلمان ہجرت کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن جاگیردار طبقہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور تھا کیوں کہ اس کی حیثیت ہندوستان میں ایک مہاجر کی سی ہو گئی تھی۔ چوں کہ پاکستان میں زمینداری کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا اس لیے اسے مجبوراً ہجرت کرنا پڑی۔ نوکری پیشہ لوگوں نے پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے چکر میں ہجرت کی۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا انھیں کسی طرح کی خوش فہمی نہیں تھی وہ مایوس تھے اقلیت میں تھے بہت کچھ کھو چکے تھے۔ وہ اب جذباتی نہیں تھے کسی مناد میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے تھے اس کا اظہار کافی ہاؤس

کی اس گفتگو سے ہوتا ہے۔

"حضور گئو کشی کی مہم بہت تیز ہو گئی ہے دوسرے
نے اطلاع دی ہے بھی ہرج ہی کیا ہے .....
اسلام نے دل آزاری سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے...
.... ۱۹۴۶ء میں بٹلر پیلس میں مرغ
کھانے کے بعد سیتا پور کے ڈاکٹر پرمولانا
نے قربانی کی حفاظت کے لیے کیا کچھ زہر اگلا
تھا..... نتیجہ کے طور پر ایک گاؤں
کے بلوے میں دو سو مسلمان اور ہندو
موت کے گھاٹ اتر گئے" [1]

ہندوستان کی تقسیم نہ صرف ایک ملک کی تقسیم ہے بلکہ اس تقسیم نے خاندان، گھر بار اور یہاں تک کہ محبت کو بھی تقسیم کر دیا۔ محبت کی اس تقسیم کو ناول میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"یہ لال پور سے ہمتی بیلا اور آخری خط
ملے گا..... کل رات ماموں جان

---

[1] "شکست کی آواز" قاضی عبدالستار ص ۱۳۸

آئے ہیں ..... کل صبح لال پور سے
چلی جاؤں گی ایک اجنبی دیس کو .....
تمہاری محبت کی قسم میں تم سے بدگمان ہیں
ہوں ..... تم حضرت گنج کی سنسان
سڑکوں پر سگریٹ پھونک رہے ہو میرے
ہاتھوں میں پاسپورٹ کانپ رہا ہے"۔ [1]

یہ جاوید کی محبوبہ اپیا کا پہلا اور آخری خط ہے۔ یہ خط نہ صرف جدائی کا بیان ہے بلکہ اس خط میں پورے ناول کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ زمیندارانہ نظام کی شکست کی آواز ہے۔ اس نظام کے بیشتر افراد خاک نشین ہو گئے۔ کچھ ہجرت کر گئے اور باقی پریشان تھے اس المیہ کو جو ایک سماجی حقیقت ہے ناول نگار نے بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔

اسی طرح "غبار شب" میں بھی زمینداری کے خاتمے کے بعد گاؤں میں رئیس کس طرح ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں دکھایا گیا ہے۔

---

[1] "شکست کی آواز" کافی عبدالستار ص ۲۴۸

ناول کا خلاصہ یہ ہے ۔ بھام پور کے دو زمینداروں
کے بیچ تصادم ہوا ۔ بھام پور کے بڑے زمیندار شیخ جی تھے ۔
شیخ جی کی زندگی کے آخری دنوں میں محرم کا جلوس نکلا ۔ تعزیہ
اتنا بڑا تھا کہ مہادیو جی کے پیپل کا پیڑ کاٹنے کی نوبت آئی ۔ چودھری
اقبال نرائن نے منع کیا تب شیخ جی خود جلوس میں جانے کے لیئے تیار
ہوئے لیکن کمزوری کے باعث نہ جا سکے ۔ لالہ اقبال نرائن عیادت
کے لیئے آئے ۔ شیخ جی نے تعزیہ کے بارے میں کہا تو لالہ جی نے
جواب دیا آپ کو اطلاع دینے والے جھوٹے ہیں تعزیہ کا جلوس
کوئی روکنے کی چیز ہے ۔ ہندو مسلم تناؤ ختم ہوا ۔ شیخ جی کو اطمینان
تو ہوا مگر وہ انتقال کر گئے ۔ جلوس جلد ختم کر دیا گیا ۔ گردو
نواح کے ہندو زمیندار تعزیت کے لیئے آنے لگے ۔ شیخ جی کے
لڑکے جمیل نے ریاست کا کاروبار سنبھالا ۔ چودھری اقبال نرائن
اور عنایت علی جو معمولی قسم کے زمیندار تھے انھوں نے گاؤں میں
اپنا رعب جمانے کی کوشش کی ۔ چودھری اقبال نرائن نے پیسے کا
سہارا لیا اور عنایت علی نے اپنی قوم کی اکثریت کا فائدہ اٹھانے
کی کوشش کی ۔ قصائی جس کا چودھری اقبال نرائن سے حساب چلتا

تھا جمیل کے یہاں خراب گوشت بھیجنے لگا۔ جمیل کو معلوم ہوا تو رام سکھ کو بھیج کر اسے پکڑوایا اور پٹائی کی۔ تھانے میں رپورٹ کی تھانے دار منشی قصائی کو پکڑ کر لے گیا۔ عنایت علی جن کے یہاں مسلمانوں کے مسائل اور چودھری اقبال نرائن جن کی چوپال میں ہندوؤں کے مسائل طے ہونے لگے تھے جمیل سے مات کھا گئے۔

ہمیشہ کی طرح ہولی کے موقع پر ستر کھ کے میلے میں شام پور کا خیمہ تاخیر سے لگایا گیا۔ ستر کھ اور مانک پور کے خیمے لگ چکے تھے۔ جمیل میلے میں گیا جہاں اس کی ملاقات مانک پور کے لالہ کی لڑکی اوشا سے ہوئی۔ وہ ستر کھ کے خیمے میں بیٹھا گفتگو کر رہا تھا کہ اسے ای کا خط ملا اس نے واپس ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ اوشا سے رخصت ہونے گیا لیکن ملاقات کیے بغیر واپس آ گیا۔ اس کے گھر پر فقیر مامور تعینات رکھتے تھے جو جمیل کے رشتے کی بات کرنے آئے تھے۔ اس وقت گاؤں کی فضا میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ مسلم لیگ کی تبلیغ شروع ہو گئی تھی۔ کئی مکانوں پر لیگی پرچم لہرا رہے تھے مولوی حضرات پاکستان کے فوائد بیان کر رہے تھے جمیل نے شادی کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ اس کی ملاقات اوشا

سے ہوئی تھی ۔ جب مانک پور کے لالہ میلے سے لوٹنے لگے تو جمیل نے ان کا ادھار کوا دیا ۔ لالہ تو چلے گئے لیکن اوشا جمیل کے یہاں رک گئی ۔ جمیل نے اپنے دل کی بات اور مجبوری اوشا سے ظاہر کی ۔

الکشن کا دور آیا ۔ منشی چکو حاجی صاحب بن کر مسلم لیگ کی سیاست لڑا رہے تھے لیکن جمیل کے گاؤں میں مسلم لیگ کی شکست یقینی تھی ۔ نتائج کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے ۔ حمام پور محفوظ رہا ۔ مانک پور سے اوشا جمیل کو دیکھنے آئی جمیل نے اوشا کو پاکستان چلنے کے لیئے کہا لیکن دونوں کے سامنے مجبوریاں تھیں پاکستان میں اوشا اوشا نہ رہ پاتی اور حمام پور کا محافظ جمیل کے علاوہ اور کوئی نہ تھا ۔ جمیل کے بڑے ماموں پاکستان جا چکے تھے ۔ جمیل کی منگیتر پاکستان میں تھی ۔ ماموں کا خط آیا ۔ جمیل کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے جمیل نے خط پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینک دیا لچھمی کی تصویر بھی پھینک دی اور اپنی جائداد غریب رشتے داروں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا کر مانک پور اوشا سے ملنے گیا ادھر اوشا کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں جمیل مایوس واپس آ گیا ۔

زمینداری کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ چودھری
اقبال نرائن جن کی دولت کا انحصار زمینداری نہیں سود کے کاروبار
پر تھا انھوں نے جمیل کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا۔ جمیل کے گھر کے
قریب سور چھوڑ دیا جسے رام سکھ نے مار ڈالا۔ اقبال نرائن نے
ہنگامہ مچانے کی کوشش کی لیکن رام سکھ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔
پنچایت کا الیکشن آیا جس میں اقبال نرائن جمیل سے ہار گئے۔ ملو
قصائی نے ایک گائے ذبح کی جو کسی برہمن کی تھی منوان نے اقبال نرائن
سے شکایت کی اقبال نرائن کو موقع مل گیا انھوں نے فساد کروا دیا۔
گاؤں کی عورتوں نے جمیل کے گھر پناہ لی تو پورے گاؤں میں آگ
لگا دی گئی۔ مسلمانوں کی فصل تباہ کر دی گئی تھانے والے آئے۔ عنایت
علی تفضل حسین پکڑے گئے۔ لالہ اقبال نرائن نے تھانے دار کو بتلایا
کہ اب ایک ہی آدمی ہے جسے پکڑنے سے امن قائم ہو جائے گا۔ جمیل
ضمانت کا انتظام کر کے پولیس کے پاس گیا۔ امن کمیٹی کا قیام عمل
میں آیا۔ جمیل چیرمن اور اقبال نرائن نائب چیرمن بنائے گئے۔ گاؤں
کا دورہ کیا گیا۔ جمیل کو اپنی شکست کا احساس ہوا۔ اس نے پورے
حادثے پر رام سکھ کے ساتھ غور کیا تو معلوم یہ ہوا کہ اقبال نرائن

ہندو تھے اس لیئے اتنی بھیڑ ان کے ساتھ آئی۔ گائے کی ضبر پر گیتا پاٹ ہو رہا تھا۔ جمیل نے کرتا دھوتی پہنی تلک لگایا اور گیتا پاٹ میں شامل ہوا۔ امبال نرائن نے جمیل میاں کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ جمیل نے کہا جمیل میاں نہیں تھام سنگھ ہوں۔ گئو ماتا کی جے کا نعرہ لگایا اور چودھری امبال نرائن سے کہا کہ آپ بھارت ورش کے کسی اور گاؤں میں اپنا بندوبست کریں تھام پور میں تھام سنگھ ہی رہے گا۔

اس طرح ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ ملک کی تقسیم تہذیب کی بھی تقسیم تھی۔ ہندوستان کا مسلم زمیندار اپنے کو اس تہذیب کا محافظ بھی سمجھتا تھا لیکن وہ لاچار بھی تھا جمیل بھی کچھ اس طرح کا خیال ظاہر کرتا ہے۔

"اور یہ مسجدیں ہیں جن میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑھی لیکن یہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی ہیں ..... یہ درگاہیں ہیں جن پر کبھی میں نے فاتحہ نہیں پڑھا لیکن ان کی حفاظت میرا فرض ہے ..... میں کہاں جاؤں .....

میں ان سب کو کہاں لے جاؤں۔ کاش میں
رئیس بھام یو رکے بجائے کسی مزدور کے گھر
میں پیدا ہوا ہوتا۔" [1]

وہ پاکستان ہجرت کرنا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ وہاں اسے ملازمت مل سکتی تھی کوئی الاٹ ہو سکتی تھی۔ اس کے ماموں پاکستان جا چکے تھے انہیں یہ سب کچھ مل چکا ہے جمیل کی منگیتر کجھ بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان میں ہے لیکن جمیل ہندوستان ہی میں رہتا ہے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد بھی اپنی شان برقرار رکھتا ہے جس سے دوسرے چھوٹے رئیسوں کو دکھ ہوتا ہے۔ جمیل کو زیر کرنے کے لیے بھام یو رکے لالہ امبال نرائن نے جمیل کے گھر کی طرف سور ہنکوا دیا جیسے رام سکھ نے مار ڈالا۔ اس چال میں کامیابی نہیں ملی تو دوسری چال چلی۔ ملو قصائی کے یہاں ایک ذبح کی ہوئی گائے ملی تو لالہ امبال نرائن نے زبردست فساد کروا دیا جس میں گاؤں کے بااثر مسلمانوں کو پکڑ لیا گیا۔ لالہ امبال نرائن نے تھانے دار سے جمیل کو پکڑنے کے لیے کہا جمیل پکڑا گیا جس سے اسے اپنی ذلت کا احساس ہوا

---

[1] "غبار شب" قاضی عبدالستار ص ۲۲۹

اس نے رام سکھ سے سبب معلوم کیا۔

"پوری لیے ہوا . . . . . کہ آج لگ آپ
کا کیسے حکم چلت ہے . . . . . آپ کی پھائیں
ماں یہاں مسلمان بے کھٹکے کیسے رہت ہیں . .
. . . . . یہاں تو اوہے جو اقبال نرائن
کہیں . . . . . تو اقبال نرائن نے میرے
خلاف دس ہزار آدمی اس لیئے جمع کر لیئے کہ
میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ہے؟ اور اگر
میں ہندو ہوتا اور اقبال نرائن مسلمان ہوتے تو
. . . . . آپ ہندو ہوتے تو بھٹارہ کے
لونڈے اقبال نرائن کا بس ناس کیے دیتے" [1]

ان منادات کی بنیاد دراصل اقتصادی تھی۔ چونکہ اقبال نرائن نو دولتیا طبقے کے تھے ان کو گاؤں میں اپنا رعب جمانا تھا اس لیئے انہوں نے یہ سازش کی اور اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیا۔ جمیل حقیقت سے واقف ہو کر جمیل میاں سے جمام سنگھ ہو گیا۔ یہ فرقہ وارانہ منادات کا حل نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک المیہ پہلو ہے۔

---

[1] "عبادِ شب" قاضی عبدالستار ص ۲۲۴-۲۲۵

# لہو کے پھول

حیات اللہ انصاری

اس ناول میں اتر پردیش کی زندگی کی تصویر
تاریخی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ناول
۱۹۱۱ء سے شروع ہو کر آزادی کی جدوجہد کے مرحلوں سے گزرتا
ہوا ۱۹۴۸ء کا یوم آزادی اور فسادات کے ہنگاموں کے ساتھ گاندھی
جی کی موت پر ختم ہوتا ہے۔ اتنے بڑے پلاٹ میں ان گنت
کردار ہیں جن کو حیات اللہ انصاری نے اپنے تخیل کی مدد سے پیش
کیا ہے۔ ناول کی طوالت کی وجہ سے اس کا خلاصہ مشکل ہے۔
مختصراً اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں سیاسی و تاریخی واقعات
کے سہارے ہر طبقہ کی ترجمانی کی گئی ہے۔ نواب صاحب مٹی ہوئی
تہذیب کے ساتھ، عیاش امیر اور پالاک زمیندار۔ اعلیٰ اور ادنیٰ
طبقے کی طوائفیں۔ کسان۔ مزدور۔ پٹواری۔ مہاجن۔ برہمن۔
کنگال۔ فقیر۔ آوارہ عورتیں عیاش مرد سیاسی مولوی، پنڈت
ڈاکو اور بے کار نوجوان یہ تمام ناول کے کردار بن کر ابھرتے ہیں۔
بڑی سیاسی پارٹیوں میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اہم رول ادا
کیے یہی اس ناول کا خلاصہ ہے۔

"لہو کے پھول" کے لیئے حیات اللہ انصاری نے جو فضا تیار کی ہے وہ جانی پہچانی ہے بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی ہم اسی ماحول میں رہتے ہیں۔ سماجی حالات، تحریکات، موجودہ فرقہ وارانہ فسادات جن سے آج کا ہر فرد واقف ہیں ہے یہی سب اس ناول کا موضوع ہے۔ فسادات اور باہمی تعصبات پر انھوں نے بہت زور دیا ہے اور تحریک آزادی میں اپنی گمشدہ مسرتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے حالاں کہ یہ مسرتیں ایسے سماجی نظام کی پروردہ تھیں جو اس ملک کی عزت پر سب سے زیادہ بدنما داغ بن کر ملک کی تقسیم اور فسادات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ناول میں فسادات سے متعلق بعض حصے بہت خوبصورت ہیں جو اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کہے جا سکتے ہیں جن میں بہت کرب کے ساتھ فسادات کی بے چین اور پیاسی روح کو پیش کیا گیا ہے جو دو قومی نظریے کی کرب ناک غمازی کرتا ہے۔ جب ملک کے دو ٹکڑے ہوئے تو ایک بھائی ہندوستان میں چھوٹ گیا دوسرا پاکستان ہجرت کر گیا۔ باپ پاکستان میں بے قرار ہے تو ماں ہندوستان میں مجبور۔ اس طرح اکثر خاندان اس سے متاثر ہوئے۔ جس نے دونوں

ملکوں کے اکثر خاندانوں میں ہیجانی کیفیت پیدا کردی ۔ اس ہیجان اور طوفانی کیفیت کی بھیانک عمازی اس ناول میں کی گئی ہے ۔ حقیقت کو سچائی کے ساتھ کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ خوف سا محسوس ہوتا ہے ۔ فسادات کے بھیانک مناظر کی طرف جو بلیغ اشارے ہیں وہ ایسی علامت ہیں جس نے یہ ثابت کر دیا کہ لوگ کن حالات میں ہجرت کر کے پاکستان پہونچے اور ان پر کیا کچھ نہیں بیتی ۔ مسلم لیگ کو قیام پاکستان کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس سے کہیں زیادہ مصائب اٹھا کر مسلمان پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے ۔

اس ناول کا سب سے اہم کردار راحت رسول ہے جو تحریک آزادی سے متاثر ہو کر پولیس کی نوکری چھوڑ کر مجاہدین آزادی میں شامل ہو جاتا ہے ۔ یہ آدرش وادی کردار ہے جو گاندھی جی کے آدرشوں پر چلتا ہے ۔ اس کے علاوہ چند اہم کردار اور ہیں ان میں فرخ ، فریدہ ، موہن جی اور سلیم کے کردار خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ اور بہت سے کردار ہیں جو ضرورت کے ساتھ ناول کے کینوس پر ابھرتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں جنھوں نے

تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور بڑی مصیبتوں کا سامنا کیا۔ رات رسول جب جیل میں تھا اس وقت سلیم سلائی کرکے گھر چلا رہی تھی بہت تنگی سے گزر بسر ہو رہی تھی مقصود اسکول کی فیس مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر فیس جمع نہ کی گئی تو نام کٹ جائے گا۔

"سلیم نے روپے لے کر گنے اتفاق سے فیس بھر کے نکل آئے۔ سلیم نے مقصود کو دے کر کہا تم لے کر فوراً چل دو۔ فریدہ نے کہا آپ کا کیا ہوگا۔ سلیم نے ایک انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔ سلیم کے اس اشارے میں کچھ ایسی مضبوطی اور امید تھی کہ فریدہ کی ہمت بندھ گئی اور وہ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئی"۔ [1]

اس سے آزادی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی رہنماؤں اور ان کے گھر والوں نے کن مشکلات کا سامنا کر کے آزادی کی جدوجہد کی ہے۔ لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر تقسیم کی

---

[1] "لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری ص ۴۵ے - ا م ے

ہولناک صورت میں سامنے آئی۔ سرجن کی گفتگو سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

"سرجن فخر کے ساتھ کہنے لگا۔ لڑکی کا بدن
یہ کمال میری سرجری کا۔ یہ لڑکی بے ہوش
ہو کر دہکتی آگ پر گر پڑی تھی۔ میں نے
چار مہینے اس کا علاج کیا اور جانے کتنے ٹانکے
لگائے ہیں اور کہاں کہاں کا گوشت اور کھال
لگائی ہے ۔۔۔ قائداعظم نے جس کمال سے مسلم
لیگ بنائی اور پھر پاکستان بنایا وہی کمال
میں نے دکھایا اس کے بدن پر۔" [1]

طربیہ کے آدھے جسم کا جل جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ نئی مملکت میں پہنچ تو گئی لیکن اپنے آدھے جلے ہوئے جسم کی طرح اپنی آدھی زندگی ہندوستان میں چھوڑ آئی ہے جس میں ماں اور بہن بھائیوں کی یادیں ہیں ان کے قتل و غارت گری کے مناظر ہیں رشتے داروں اور احباب کی ملاقاتیں ہیں جس کی یاد اس کے ذہن میں

---

[1] "لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری ص ۲۵۲

اس کے جلے ہوئے جسم کی طرح سے ایک بد نما داغ بن کے رہ گئی ہے۔
یہ آدھا جلا ہوا جسم اس بات کی طرف بھی نشاندہی کرتا ہے کہ
وہ ہندوستان کو کبھی نہ بھول پائے گی۔ سیاسی حالات سے مجبور ہو کر
اپنے آپ کو مافی سے بے تعلق کرنا پڑا جو آخر دم تک اس کی پیاسی
روح کو تڑپاتا رہے گا۔

دوسرا بھیانک منظر وہ ہے جہاں ڈاکٹر اپنے بیگ
میں سے ایک جار نکالتا ہے جس میں انسانی آنکھیں ہیں جو ڈاکٹر
نے اپنے خاندان کے قتل و غارت گری اور بیٹی کے آگ میں جل
جانے کے بعد نکالی ہیں۔ انتقام کی جو آگ اس کے سینے میں دہک
رہی تھی اس نے اس طرح بجھائی۔ انتقام کا یہ ایک ایسا بھیانک
منظر ہے جسے کسی دوسرے ناول نگار نے اتنے موثر انداز میں
پیش نہیں کیا۔

"سرجن شفقت نے اپنے ہینڈ بیگ
سے شیشے کا ایک مرتبان نکالا جو آٹھ
انچ اونچا اور چار انچ قطر کا تھا اس میں
اسپرٹ میں بہت سی کالی کالی چیزیں

تیر رہی تھیں ۔ دیکھیئے میرے کارنامے کس
طرح چمک رہے ہیں جیسے آسمان پر تارے ۔
اور کیوں نہ ہو ان میں سے ہر لڑکی اپنی جگہ
ایک فلمی ستارہ تھی ۔ پہلے تو میری سمجھ میں
نہ آیا کہ مرتبان کے اندر کالی کالی چیزیں کیا
ہیں لیکن ذرا دیر بعد میرے منہ سے چیخ
نکل گئی ۔ وہ سب آنکھیں تھیں آنکھیں ہی
آنکھیں ۔ آنکھوں کے ڈھیلے پورے مکمل
کالے دیدے، نیلے دیدے، بھورے دیدے
شرمیلی دیدے اور ہر طرح کے دیدے ہی
دیدے ۔ وہ سب مجھے گھور رہے تھے اور
ان سب دیدوں میں وہی نظریں تھیں جن
کو ہم لوگ روزانہ گورمنٹ ہاؤس آتے
جاتے ان مہاجرین میں دیکھا کرتے تھے جن
کا سڑکوں کے دونوں طرف دور تک ڈھیر
لگا ہوتا تھا ۔ بھوکی نظریں، ننگی نظریں، مایوس

نظریں، انتقامی نظریں، نیم مردہ بوڑھیاں
ایں ایں کرتے ہوئے پیٹوں والے بچے، عصمت
کو ہتھیلی پر لیئے ہوئے گھومنے والی شریف زادیاں
اور اپنی خاندانی وجاہت اور سندوں کے حوالے
دینے والے نوجوان جیسے سانپ کے دیدوں کے
سامنے گرگرپا بے حس و حرکت ہو جاتی ہے
ویسی ہی عین ہو گئی تھی اس مرستان کے سامنے۔
معلوم ہوتا تھا کسی نے ہپناٹزم کر دیا ہے مجھ پر۔"

ناول کے اس حصہ میں حیات اللہ انصاری کا قلم ایک فن کار کی طرح بر جستگی اور بے باکی سے منافرات کے مناظر کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور تقسیم کا خوف اور کرب قاری کے وجود میں زہر گھولنے لگتا ہے۔

ہندوستان میں ملک کی تقسیم کے سانحہ منافرات کا سلسلہ شروع ہوا تو ناول نگار نے اس کی ساری ذمہ داری مسلم لیگ پر ڈال دی ہے۔ حالاں کہ کانگریس خود ایسے عناصر سے

---

۱۔ "لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری ص ۱۲۸۶

پاک نہیں تھی جو فرقہ پرستی کو ہوا دے رہے تھے۔ کانگرسی رہنماؤں
میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے فرقہ پرستی کو ہوا دی اور پوری
سوسائیٹی میں زہر گھول دیا جس کا خمیازہ آج تک ہندوستان کے
عوام بھگت رہے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے کہا ہے

"ملک کی تقسیم کی پوری ذمہ داری کانگرسی
رہنماؤں کی غلط سیاست کے اوپر عائد ہوتی
ہے جنھوں نے ایک طرف مسلم اور ہندو فرقہ
پرستی کی ہوا دی اور شروع سے سیاسی تحریک
کے مذہبی احیاء پرستی سے خلط ملط کر کے مہاراج
کو رام راجیہ اور سیاسی رہنماؤں کو مہاتما کا
روپ دے کر سمجھوتہ کر لیا" [1]

خود کمیونسٹوں کو اپنی غلطی کا احساس ہے کہ انھوں نے کیوں اپنی
سیاست کی باگ ڈور گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ہاتھوں میں دی۔
حیات اللہ انصاری نے اپنے ناول میں کمیونسٹوں کو کوئی جگہ نہ
دی حالاں کہ یہی وہ جماعت ہے جس نے سب سے پہلے ہندوستان

---

[1] "لہو کے پھول" تبصرہ ڈاکٹر محمد حسن۔ عصری ادب جنوری اے ص ۴۳

میں مزدوروں اور کسانوں کو منظم کیا۔ حیات اللہ انصاری نے کانگریس کے علاوہ ہر تحریک کو ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب ہم ناول کے آخری حصہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ناول نگار کانگریسی ہونے کے باوجود موجودہ برائیوں پر سے پردہ اٹھانے پر مجبور ہے۔

"میرا بھتیجا فرسٹ کلاس ایم۔ اے تھا لیکن اس کو یونیورسٹی میں جگہ نہیں ملی اور ایک سکنڈ کلاس پانے والے ہندو کو مل گئی"۔

..... سکریٹریٹ میں کوئی کام پڑ جائے تب ان لوگوں کے تعصب کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمانوں کے فائل چیونٹی کی رفتار سے ایک میز سے دوسری جگہ جاتے ہیں"۔ [1]

"اتنا میں جانتا ہوں کہ اگر ہندو راج آگیا تو مسلمانوں کو نہ سروس ملے گی اور نہ ٹھیکے

---

[1] "لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری ص ۲۱۳۸

وغیرہ اور نہ ان کے لیے عزت کی کوئی جگہ
ہوگی وہ زیادہ سے زیادہ ہو سکیں گے تو چپراسی
ہی ہو سکیں گے ۔ یوں ہو کہ اچھوت بن جائیں
گے اچھوت !" [1]

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں آزادی کے بعد وہ کتنی زبوں حالی کا شکار ہیں ۔ آج جو کچھ حالات ہیں اس سے کون واقف نہیں جس کا سامنا ہندوستان کے ہر مسلمان کو کرنا پڑ رہا ہے ۔

# آزادیؔ

چمن نہال

اس ناول کو ۱۹۸۴ء میں ساہتیہ اکاڈمی نے بہترین
ناول کا ایوارڈ عطا کیا۔ ناول کی ابتداء ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو
وائسرائے کے تقسیم کے اعلان سے (جو انھوں نے ریڈیو سے
براڈ کاسٹ کیا تھا) ہوتی ہے۔ اور گاندھی جی کی شہادت پر
ناول کا اختتام ہوتا ہے۔

مختصر طور پر ناول کا خلاصہ یہ ہے۔ لالہ کاشی رام
سیالکوٹ (مغربی پنجاب) کے غلہ کے بیوپاری ہیں اور اپنے حلقے
میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پربھادانی ان کی
بیوی ہے اروون لڑکا اور مدھو لڑکی ہے۔ فساد کے وقت ان
کے دوست چودھری برکت علی نے ان سب کو بحفاظت رضیوجی
کیمپ منتقل کیا۔ ان فسادات میں لالہ کاشی رام کو بہت سے
نقصانات اٹھانے پڑے۔ گھر چھوڑنا پڑا۔ دکان لوٹ لی گئی ان
سب سے بڑھ کر ان کی لڑکی مدھو اور داماد بھی فسادات کی نذر
ہو گئے۔ دہلی ہجرت کرنے کے بعد بھی ڈھائی ماہ تک انھیں رہنے
کے لیے کسی گھر کا انتظام نہ ہو سکا اور وہ وہیں کنگز وے کیمپ میں

اپنے افراد خاندان کے ساتھ تھے۔

اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے گھر اور اس کے
در و دیوار سے کس کو محبت نہیں ہوتی؟ ہندوستانی مہاجرین
ہوں یا پاکستانی شرنارتھی کیا اپنے وطن سے بچھڑتے ہوئے ان کی
آنکھیں نہیں بھیگی ہونگی؟ اپنے گھروں پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے
ان کا دل نہیں رویا ہوگا؟ ان گلیوں میں جن میں ان کا بچپن گزرا
تھا خیرباد کہتے ہوئے ان کی روح نہیں تڑپی ہوگی؟ لیکن اس
آزادی نے نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنے وطن میں بے وطن کر دیا
اور اپنے گھر میں بے گھر۔ ناول میں لالہ کانشی رام کو جب اس
بات کا یقین ہو گیا کہ انھیں اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا ہوگا تو
ان کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

"ہو سکتا ہے انھیں یہاں سے جلد ہی کوچ کرنا
پڑے اس خیال سے ان کے دل پر ایک گھونسہ
لگا اور وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگے
رفیو جی۔ ہاں رفیو جی! کتنی دہشت تھی اس
ایک لفظ میں۔ وہ لرز کر رہ گئے۔ میں یہاں

پیدا ہوا ہوں یہی میرا گھر ہے۔ میرا
سب کچھ یہیں ہے میں اپنے ہی گھر میں
رفیوجی کیسے ہو سکتا ہوں؟ ..... وہ
بڑی بے کلی سے کمرے کی دیواروں پر ہاتھ
پھیرنے لگے وہ ہرگز اس سے دستبردار
نہیں ہونگے۔" [1]

دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کی تقسیم ہوئی لیکن یہ تقسیم غلط تھی۔ اس کا اظہار ناول میں اس طرح کیا گیا ہے

"..... کتنا طویل عرصہ ہم نے ایک ساتھ گزارا ہے۔ لالہ کانشی رام نے چودھری برکت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر چودھری برکت علی پیر بھارانی کی جانب مڑ کر بولے بہن خدا حافظ۔ اگر ہماری زندگیوں میں نہیں تو ہمارے بچوں کی زندگیوں میں انشاء اللہ اس

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۱۵۷-۱۶۰

غلطی کا ازالہ ضرور ہو گا۔ ہم ایک قوم
ہیں اور مذہب ہمیں ایک دوسرے سے
جدا نہیں کر سکتا۔" [1]

فسادات میں انسان نے بربریت کا وہ کھیل کھیلا ہے انسانیت
پر سے لوگوں کا ایقان اٹھ گیا۔

"جلوس آپہنچا۔ دو دو عورتیں ساتھ
چل رہی تھیں ان کی تعداد چالیس تھی
عورتوں کی عمریں سولہ اور تیس کے
درمیان تھیں۔ خباثت اور ذلالت کی
انتہا تھی۔ رہی سہی کسر پوری کرنے کے
لیے آخر میں دو ایسی عورتوں کو رکھا
گیا تھا جن کی عمر ساٹھ سے بھی تجاوز کر چکی
تھی۔ سب کی سب برہنہ تھیں.....
ان کی حالت غیر تھی نگاہیں زمین پر اور
چال بے قاعدہ اور بھونڈی تھی۔ چہرے

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۳۴۳

مسخ ہو کر مضحکہ خیز ہو گئے تھے آنکھیں
خشک تھیں لیکن ان سے وحشت جھانک
رہی تھی ..... ان کی بے حرمتی اتنی
بے دردی سے کی گئی تھی، ان کو اس
بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا کہ
ان کے احساسات مردہ ہو چکے تھے
ان کے اندر کی عورت مر چکی تھی یہ
صرف جلتی پھرتی لاشیں تھیں۔" [1]

کسی میں آدمیت، انسانیت اور شرافت کا نام نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ اس کو محض ذلالت کہنا غلط ہے یہ تو شیطانیت مجسم تھی۔ تمام عالمی اقدار پامال ہو چکی تھیں۔ پستی کی انتہا ہو چکی تھی انسان ظلمت کی لامحدود گہرائیوں میں گر کر اندھا ہو چکا تھا۔ حکومت بھی ان مظالم کو روکنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ بلکہ حکومت کے عہدیدار مسلح سپاہیوں نے جنھیں لوگوں کی حفاظت کے لیے تعینات کیا گیا تھا انھوں نے بھی مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۳۶۹-۳۷۰

"ہندوستانی سپاہی مشین گنوں سے مسلح
تیار کھڑے تھے۔ لیکن یہ محض دکھاوا تھا
دھونگ تھا پاکستانی سپاہیوں کی طرح یہ
بھی سب کے سب فراڈ تھے انھوں نے
اپنی ذمہ داری سے انحراف کیا تھا یہ
مسلمانوں کو تحفظ دینے میں ناکام ہو چکے
تھے۔ ٹرین کے ساتھ چلنے والے حفاظتی
پاکستانی دستے نے اسٹیشن کے ہندو
عملے پر مشین گنوں سے فائرنگ کی تھی
اسٹیشن پر تعینات ہندوستانی فوج نے
تمام پاکستانی سپاہیوں کو گولیوں سے
اڑا دیا تھا" [1]

تمام مظالم برداشت کرنے کے بعد مہاجرین جب دوسرے ملک پہنچے تو انھیں دوسرے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ مہاجرین سے پوچھ تاچھ کرنے اور ان کی آبادکاری کے لیے جن افسروں کو مقرر کیا گیا تھا

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۱۸۴

ان کے بارے میں ناول میں بالکل صحیح عکاسی کی گئی ہے۔

"عہدے کی طاقت نے ان کے دماغ عرش
معلّیٰ پر پہنچا دیے تھے انھیں اکھڑ اور
بدمزاج بنا دیا تھا۔ ان کے پاس کسی کی بات
سننے کی فرصت نہ تھی۔ صاحب کو مرد
میں لانے کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے
ایک کلرک نے بارہ لوئی دفتر میں
لالہ کانشی رام سے کانا پھوسی کی۔ تمہارے
پاس رقم ہے؟ اس نے جگالی کرتے ہوئے
پوچھا۔ 'نہیں' اس کے بعد کلرک نے
ان کی طرف نہیں دیکھا اس نے ایک فائل
اٹھائی اور اس میں محو ہو گیا۔" [1]

تقسیم نے صرف ملک کا ہی بٹوارا نہیں کیا بلکہ شخصیت کا بھی بٹوارا ہو گیا تھا۔ ناول کے آخری حصہ میں لالہ کانشی رام سوچتے ہیں

"بٹوارے کے تھپیڑوں نے جو لفظاں

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۳۶۴

ان کی شخصیت کو پہنچایا تھا اس کا خسارہ کون
چکا سکتا تھا؟ ان کا ریٹہ ریٹہ حالات کے
تھپیڑوں اور شکستوں سے چور تھا اور ان
کے مالی نقصانات؟ اور مدھو؟ مالی نقصان
ایک طرف لیکن کیا کوئی ان کی مدھو انھیں واپس
دلا سکتا تھا؟ انھوں نے ایک ثانیہ ٹھہر کر
سوچا۔ انھیں اپنے سامنے نا امیدی اور بربادی
کے لق و دق صحرا اور بدنصیبی کی سیاہی کے سوا
کچھ نظر نہ آیا۔ لمبی قطاریں، بے مقصد انتظار
درخواستیں جمع کرانا، پھر مزید درخواستیں اور
ان سب کے بعد تاریکی۔ گہری تاریکی۔ انھیں
ایسا محسوس ہوا گویا وہ ایک تاریک سرنگ
کے دہانے پر کھڑے ہوں۔ یہ سرنگ کتنی لمبی
تھی؟ انھیں کہاں لے جائے گی؟ انھیں کچھ معلوم
نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔" [1]

---

[1] "آزادی" چمن نہال مترجم شجاع الدین صدیقی ص ۶۲م

اس طرح اس ناول میں تقسیم ہند کے وقت جو فسادات ہوئے ان کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ انسانوں کے خون سے کس طرح ہولی کھیلی گئی، لوگوں کی املاک کس طرح تباہ ہوئیں، عصمت کس طرح تار تار ہوئی، کس طرح انسان وحشی درندوں میں تبدیل ہوا ان سب حقائق کو بڑے بے باکانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان سب سے ہٹ کر شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں کی باز آبادکاری کا مسئلہ ایک ایسا سنگین مسئلہ تھا جس کا حل خود حکومت کے پاس بھی واضح طور پر نہیں تھا اور پھر حکومت کا ان مہاجرین کے ساتھ بدترین سلوک۔ ان سب حقائق کو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال ملک آزاد ہو چکا تھا اور آزادی کے نام پر بڑھتے ہوئے قدموں نے انسانیت کی پستی کی انتہا کر دی تقسیم نے جہاں جانی و مالی نقصانات پہنچائے وہیں "شخصیت" کو بھی مسخ کر ڈالا۔ نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی ایک خاص شناخت تھی لیکن تقسیم کے تھپیڑوں نے ان کی اس شناخت کو اس قدر مسخ کر دیا کہ وہ خود اپنے لیے بھی اجنبی بن گئے۔

# پاکستان اکسپریس

خشونت سنگھ

"پاکستان اکسپریس" کا موضوع دوران تقسیم ہند و
پاکستان کے فسادات ہیں۔ ناول پنجاب کے ایک گاؤں منو ماجرا
کے گرد گھومتا ہے جس کی بیشتر آبادی سکھ ہے اور ان کے مزارعے
مسلمان ہیں۔ یہ تمام لوگ سیدھے سادے ہیں انھیں ملک کی تقسیم
تک کا علم نہیں۔ سکھوں کے دل میں بھی کوئی جذبہ منافقت نہیں۔
ڈپٹی صاحب کے پوچھنے پر کہ "منو ماجرا کے حالات تو ٹھیک ہیں
نا؟" تھانیدار کہتا ہے

"تا حال تو سب ٹھیک ہے نمبردار ہر روز
رپورٹ فراہم کر رہا ہے۔ گاؤں میں اس
وقت تک کسی مہاجر نے بھی قدم نہیں رکھا۔
میرا خیال ہے کہ ابھی تک کسی کو یہ بھی علم
نہیں کہ انگریز چلے گئے ہیں اور دیش کے
دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔" [1]

مگر کچھ اشتعال پسند سکھوں کو اشتعال کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔

---

[1] "پاکستان اکسپریس" خشونت سنگھ ص ۲۵

مسلمانوں کو پہلے کیمپ میں بھیجا جاتا ہے جہاں سے انھیں ایک ٹرین کے ذریعہ پاکستان لے جایا جاتا ہے۔ فسادی ایک منصوبہ بناتے ہیں کہ ٹرین میں مسلمانوں کا قتل کر دیا جائے کیوں کہ پاکستان سے جو ٹرینیں آتی ہیں اس میں ہندو اور سکھ کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ چناں چہ ناول میں قتل کے منصوبہ کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

"اسکیم یہ ہے کہ کل غروب آفتاب کے بعد
جب اندھیرا ہو جائے تو ہم پل کی ابتدائی
آہنی باڑھ کے ساتھ ایک رسی باندھ دیں گے
اس کو گاڑی کی چھت سے ایک فٹ اونچا
کر کے باندھیں گے جب گاڑی اس کے نیچے
سے گزرے گی تو یہ رسہ چھت پر بیٹھے
سبھی مسلمانوں کا صفایا کر دے گا۔ چار
پانچ سو تو ہو ہی جائیں گے۔" [1]

اس منصوبے کے مطابق کھمبے سے بندھے آہنی رسہ کو نیچے گرایا جاتا ہے جس سے ٹرین کی چھت پر بیٹھے مسافر از خود ختم ہو جائیں۔ ٹرین کی

---

[1] "پاکستان اکسپریس"، خشونت سنگھ ص ۱۳۶

رفتار میں کچھ دھیما پن آنے سے باقی مسلمانوں کو بھی ختم کر دیا جانا تھا۔
جس رات اس منصوبے پر عمل ہونا تھا اس سے کچھ دیر پہلے دو ملزموں
کو جیل سے رہا کر دیا جاتا ہے۔ ان میں ایک جگت سنگھ ہے جو دس نمبری
بدمعاش ہے اسے تھانے میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ دوسرا اقبال سنگھ
ہے جس کے نام کی بنا دپر یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان اور مسلم لیگی
ہے۔ اقبال سنگھ ایم۔ اے پاس ہے۔ حالات کی ناگواری کا احساس
دونوں ہی کو ہوتا ہے۔ اقبال سنگھ ذی علم اور دانشور ہے لیکن
ضمیر کو آسودہ کرنے کے لیے شراب نوشی میں مداوا ڈھونڈ لیتا ہے
دس نمبری جگا کبھی کبھی جگت سنگھ بن جاتا ہے۔ رات ہونے پر وہ
گرنتھی ست سنگھ سے درخواست کرتا ہے کہ اسے گوربانی سنائے اس
کے بعد وہ سگنل کے کھمبے پر چڑھ کر آہنی رسے کو کاٹنے میں مصروف
ہو جاتا ہے۔ نیچے سے گولیاں چلتی رہتی ہیں مگر مرنے سے پہلے وہ
رسے کو کاٹ دیتا ہے اور گاڑی بغیر کسی نقصان کے اس کی لاش پر
سے گزر جاتی ہے۔

اس ناول کے تعارف میں گوپال متل لکھتے ہیں "ناول
کے مطالعے کے بعد آپ خشونت سنگھ کے طرز نگارش کی داد تو

دیں گے ہی لیکن یہ کافی نہیں۔ بہترین دار یہ ہوگی کہ ہم اپنے دل کو
شُدھ میں کسی نہ کسی گو شے میں جگت سنگھ ضرور چھپا ہوگا جس طرح
وہ دس نمبری جگے کے دل میں چھپا ہوا تھا اگر ہمارے دلوں میں
چھپا ہوا یہ جگت سنگھ بیدار ہو جائے تو موجودہ ماحول کی سب تلخیاں
از خود ختم ہو جائیں گی۔"

# اختتاميه

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور
یہ آزادی خون میں لتھڑی ہوئی آئی۔ کیوں کہ ملک تقسیم ہو گیا یہ
تقسیم اچانک نہیں ہوئی بلکہ انگریزوں نے بہت پہلے سے اس کے لیے
فضا ساز گار کر لی تھی جن میں انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت
کرو" اور "دو قومی نظریہ" اور اس کے اقتصادی و فکری
عناصر بہت اہم ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں
بدنظمی ضرور تھی لیکن ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے تھے جیسا کہ انگریزی
حکومت کے دوران ہوئے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں
مذہب کی بنیاد پر جارحانہ فرقہ پرستی کی بنیاد ڈالی اور ہندوؤں
اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس وقت
انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے اس وقت
ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ سکھوں اور
مرہٹوں نے اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ہندوستان
میں آتے ہی انگریزوں نے اندازہ لگا لیا کہ بدنظمی کے اس ماحول
میں نفاق کا بیج آسانی سے بویا جا سکتا ہے چناں چہ اقتصادی

معاشی اور سیاسی طرز عمل میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو
کے اصول کو اپنایا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندو مسلمان دونوں نے
متحد ہو کر مظاہرہ کیا تھا جس سے انگریز بہت پریشان ہو گئے تھے
اس لیئے انھوں نے ہندو مسلم اتحاد توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔
بغاوت کے فوری بعد انھوں نے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے اور وسیع
پیمانے پر ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔ ان حالات سے مایوس ہو کر
مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف راغب ہونے کے بجائے روایتی
اور مذہبی تعلیم کو اپنایا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں نے ترقی
کے مواقع زیادہ حاصل کیئے۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر رپورٹ کے
مطابق یونیورسٹی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳٫۶۵ فیصد تھی
مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ جس میں نواب اور زمیندار شامل تھے ہندو
تاجر اور سرمایہ داروں کی ترقی دیکھ کر خوش نہیں ہوا کیوں کہ
انھیں احساس دلایا گیا کہ یہ ہندوؤں کی ترقی ہے۔ اس طرح ہندو
تاجر سرمایہ دار اور مسلم نواب زمیندار میں نفاق پیدا ہو گیا۔
انتظامیہ میں تعلیمی قابلیت کی بناء پر نوکری دی جاتی تھی مسلمان

تعلیم میں بہت پیچھے تھے اس لیے وہ اسٹامپ میں بھی نہ آسکے۔ ان کے مقابلے میں ہندو متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے بڑی تعداد میں نوکری حاصل کرلی۔ اس سے مسلمان ان کے خلاف ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے کچھ ایسے کام کیے جس کی وجہ سے ہندوستان میں قومی تحریک کو فروغ ہوا۔ اس قومی تحریک کو فروغ دینے میں بین الاقوامی اثرات بھی اہم ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں حبش نے اٹلی کو شکست دی تھی اور ۱۹۰۵ء میں روس کو جاپان نے شکست دی اس سے متاثر ہو کر کراچی کے اخبار "کرانیکل" نے ۱۸ جون ۱۹۰۵ء کے شمارے میں لکھا۔

"ایک ایشیائی ملک نے جو کچھ کیا ہے وہی ایشیا کی دوسری قومیں بھی کرسکتی ہیں..... اگر جاپان روس کو شکست دے سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان انگلستان کو شکست نہ دے سکے..... آؤ ہم سب مل کر انگریزوں کو سمندر میں دھکیل دیں اور جاپان کے ساتھ

ہم بھی دنیا کی عظیم طاقتوں کی محفل میں اپنی
جگہ بنالیں۔" [1]

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں قومی تحریک نے زور پکڑ لیا اور اس تحریک میں وکیل، تاجر، صنعت کار، محافی اساتذہ، زمیندار، ہندو، مسلم سبھی شامل ہو گئے۔ ان میں پھوٹ ڈالنے کے لیے لارڈ کرزن نے بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ لارڈ کرزن کو یہ توقع تھی کہ بنگال کے مشرقی علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت موجود ہے۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال بن جانے سے مسلمان مشرقی بنگال میں وہاں کے انتظام میں زیادہ حصہ پانے کا مطالبہ کریں گے جس کی وجہ سے ہندو مسلم سیاسی کشمکش شروع ہو جائے گی اور پورے بنگال میں حکومت کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے کمزور پڑ جائے گی مگر جب ہی لوگوں کو اس تجویز کا پتہ چلا ہندو مسلم بنگالیوں نے متفق ہو کر اس کی مخالفت کی لیکن کرزن نے مسلمانوں کو اس کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے مشرقی بنگال کا دورہ کر کے عوامی جلسے کر کے انہیں سمجھایا

---

[1] "جدید ہندوستان" بپن چندرا ص ۲۸۸

"مشرقی بنگال کو ایک الگ صوبہ بنانے کا خاص
مقصد یہ ہے کہ وہ ایک مسلم صوبہ ہو جس پر اسلام
اور اس کے پیروؤں کا غلبہ ہو ..... تقسیم
بنگال کی بدولت مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں
وہ اتحاد پیدا ہو جائے گا جو انھیں پرانے زمانے
کے مسلمان صوبہ داروں اور بادشاہوں کے بعد
آج تک نصیب نہیں ہوا" [1]

آخرکار ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے قانون ساز کونسل میں تقسیم بنگال کی تجویز منظور کروالی۔ دانشور ہندو مسلم تقسیم کی مخالفت کرتے رہے لیکن کچھ مسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا کہ اب حکومت ان کے ہاتھوں آ گئی ہے اس نے زمیندار سرمایہ دار کے خلاف جو زیادہ تر ہندو تھے سوزش کی شکل اختیار کر لی جس سے سارے صوبے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں مسلم لیگ میں اعلیٰ طبقہ کے مسلمان زمیندار شامل

---

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۸۹

تھے کانگریس کی طرح مسلم لیگ بھی جلد ہی انگریزوں کے خلاف
قومی تحریک میں حصہ لینے لگی۔ مسلم لیگ نے ۱۹۱۲ء میں سوراج حاصل
کرنا اپنا مقصد بنالیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے دوسری
پارٹیوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان
بھی سمجھوتے کی بات چیت ہونے لگی۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ پر
دونوں پارٹیوں کے عہدیداروں نے دستخط کیے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۷ء
تک کانگریس اور مسلم لیگ میں خوشگوار تعلقات قائم رہے۔
۱۹۲۷ء میں کانگریس نے نہرو رپورٹ کی شکل میں برطانوی
گورنمنٹ کو ہندوستان کے مستقبل کا آئین پیش کیا تو اس میں جداگانہ
انتخاب اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک تہائی
نشستوں کی شرائط جو لکھنو پیکٹ میں منظور کیا گیا تھا ختم کر دیا
گیا جس سے مسلم لیگ کے لیڈروں کے دل میں ہندو اکثریت کے بارے
میں شبہات پیدا ہو گئے اور مسلم لیگ نے مخالفت شروع کر دی۔
اس طرح مسلم لیگیوں کے خدشات، کانگریسی لیڈروں کی بیزاری
اور انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی مل کر قیام
پاکستان کا سبب بنے۔ تقسیم کے مطالبے کی مسلم زمینداروں اور

نوابوں نے حمایت کی۔ اس طبقے کو یہ آثار دکھائی دینے لگے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوتے ہی یہاں زمیندارانہ نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا جس سے ان نوابوں اور زمینداروں کی عیش و عشرت چھین جائے گی۔ یہ طبقہ مسلم لیگ پر پوری طرح حاوی تھا۔ اس نے پارٹی پر تقسیم ہند کے مطالبے کو منوانے کے لیے دباؤ ڈالا۔ ہندوستان کو ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے کانگریس نے پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا اس طرح ایک کلچر اور ایک تہذیب بھی بکھر گئی۔

تقسیم کا کرب تمام ادیبوں پر پڑا۔ اردو ناولوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد فسادات پر ناول لکھنے کا سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد فسادات کے موضوع پر جو ناول لکھے گئے ان ناولوں میں ایک نقطۂ نظر تو رامانند ساگر کا تھا کہ دراصل یہ فسادات انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھے جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انسانیت مر چکی ہے۔ "اور انسان مر گیا" کا مطمعِ نظر خالص انسان دوستی ہے اور یہ ناول سیکولر اقدار کی بنا

پر ایک اعلیٰ مقصد کا حامل ہے۔ اس کے برخلاف ایم۔ اسلم کا ناول "رقص ابلیس" یک رخا ناول ہے اس میں صرف ہندوؤں کے مظالم کی داستان پیش کی گئی ہے۔ نسیم حجازی کا ناول "خاک اور خون" مشرقی پنجاب کے سادات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں نسیم حجازی نے سادات کا ذمہ دار اگرچہ کانگریس کو ٹھہرایا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں کے دور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ناول میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کو بیان کیا گیا ہے۔ کرشن چندر کا ناول "غدار" ہجرت کے دوران فساد سے متعلق ہے۔ جمن ہل نے اپنے ناول "آزادی" میں مغربی پنجاب کے ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کو دکھایا ہے۔

ناول ایک بڑا فن ہے۔ مجموعی طور پر اس کا موضوع ایک عہد، ایک معاشرہ ہوتا ہے یا یہ ایک فرد کی مکمل تصویر بھی ہوتا ہے۔ ناول نگار افراد کی مدد سے پورے معاشرے اور پورے عہد کو اور ان کی اقدار کو ناول میں سمیٹ لیتا ہے یہی بات قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کے متعلق خود قرۃ العین حیدر کا خیال ہے کہ انھوں نے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلم بند کی ہے۔ یہ المیہ ہندوستان کی تقسیم ہے جس کے نتیجہ میں لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور ایسے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ختم کیا گیا جو صدیوں کے اتحاد اور باہمی رشتے سے پیدا ہوا تھا۔

اودھ کے متعلقہ اردو کا طبقہ قرۃ العین حیدر کا آئیڈیل طبقہ ہے وہ ان کے ذکر سے یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ کچھ اعلیٰ قدریں جو ان کے دم سے قائم تھیں ان کے دم توڑ جانے پر یا تو ختم ہو گئیں یا ختم ہونے والی ہیں۔ "آگ کا دریا" ایک عہد ساز ناول ہے اس ناول کی ابتدا اودھ سلطنت کے عروج کے زمانے سے ہوتی ہے اور تقسیم پر ناول ختم ہوتا ہے۔ انھوں نے ناولوں میں تقسیم کی ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد کی ہے لیکن تقسیم کے اقتصادی پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ پاکستان میں جن صوبوں کے الحاق کا مطالبہ تھا ان کی اقتصادی حالت تباہ کن تھی اور وہ مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔ مسلم سرمایہ دار طبقہ جو بہت بعد میں وجود میں آیا مسلم اکثریت والے صوبوں میں اپنے مال کے لیے منڈی محفوظ کروانا چاہتا تھا۔ "آگ کا دریا"

کے آخری حصہ میں انھوں نے پاکستانی معاشرے خصوصاً مہاجرین
کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے۔
ان پر نوسٹلجیا کا لفظ بطور الزام کے لگایا جاتا ہے لیکن یہ ایک
حقیقت ہے ان کے تینوں ناولوں میں یہی کیفیت ملتی ہے۔
"چاند گہن" ان کا پہلا ناول ہے اس میں سادات کے ذکر کے ساتھ
مہاجرین کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے دوسرے ناول
"تذکرہ" میں بھی مہاجرین کے رہائش کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔
"بستی" کا آغاز اگرچہ تقسیم ہند کے کئی سال بعد پاکستان کے دور افتادہ
سے ہوتا ہے لیکن اس میں بھی بارہا ماضی کی یاد غالب آجاتی ہے۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے جسم کا کوئی اہم حصہ کٹ کر ان
سے علیحدہ ہو گیا ہے۔

خدیجہ مستور نے اپنے ناول "آنگن" میں معاشرت
پر تقسیم کے اثرات کو پیش کیا ہے۔ اس کا ٹائیٹل علامتی رنگ لیے ہوئے
ہے کہ ملکی اور قومی سطح پر جو انقلاب آرہا تھا جو جنگ لڑی
جارہی تھی وہ گھر سے باہر بھی لڑی جارہی تھی اور گھر کے اندر بھی ۔

کیوں کہ گگر کے اندر ایک ذہنی انقلاب کا معاملہ تھا یعنی سیکڑوں سال کی فرسودگی کو ختم کرنا۔ "آنگن" ۱۹۳۲ء سے شروع ہو کر تقسیم کے المیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ہندوستان کے اقتصادی نظام، تہذیبی انحطاط اور سیاسی جہاد میں متوسط مسلم طبقہ کے مسلمانوں کی جو حیثیت اور حصہ رہا ہے اس کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے اپنے ناول میں ایک خاص نکتہ کو پیش کیا ہے وہ ہے ہجرت کے بعد پاکستان میں مہاجرین اور ہندوستان میں شرنارتھیوں کا بڑی جالاکی کے ساتھ متروکہ جائداد پر قبضہ کرنا۔ اس مسئلے کو انھوں نے اپنے دوسرے ناول "زمین" میں بھی پیش کیا ہے اور اس میں انھوں نے بے شمار مہاجر لڑکیوں کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" تقسیم کے متعلق نتائج کو پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے تمام واقعات کو کسان کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس میں پنجاب کے کسان کی جرأت، جفاکشی زبوں حالی اور محنت کے استحصال کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" کا موضوع تقسیم سے کچھ قبل کی زندگی ہے۔ اس ناول کے واقعات کی ایک مرد راوی کے بیان سے ترتیب دیا گیا ہے جسے کنول کماری نگاہ کرے بے حد عقیدت ہے۔ ناول کا نام بہت ہی بامعنی ہے۔ کیا آزادی کے متوالوں نے اسی بہار کے خواب دیکھے تھے؟ کیا یہ وہی بہار ہے جس کے آنے پر فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا؟ کیا یہ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والوں کی تلاش میں مصروف زدہ بہار تھی؟

"لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری کا بہت ضخیم ناول ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص مسائل، اکثریت سے ان کے تعلقات، جنگ آزادی میں ان کا حصہ ان کے سلسلے میں اکثریت کے رویے میں بتدریج تبدیلی اور سختی۔ ان کا احساس جرم، احساس شکست، ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی روشنی میں ان کی سماجی اور سیاسی حیثیت، ان کی تعلیم، زبان اور تہذیبی سرمائے کے مسائل ان کی معاشی ابتری کی مفصل اور بے دردانہ عکاسی کی گئی ہے۔

قاضی عبدالستار کا پہلا ناول "شکست کی آواز"
ہے اس میں انھوں نے آزادی کے بعد اودھ میں زمینداری کا
خاتمہ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کیا ہے۔ "غبار
شب" میں بھی اسی موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ناولوں
میں دیہی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ خاتمہ زمینداری نے
دیہی معاشرت کو تباہ کر دیا اس طرح جاگیر دار طبقہ جو پہلے ہی سے
زوال آمادہ تھا اس کی پوری آب و تاب ختم ہو گئی۔ نہ صرف
زمیندار کے معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑا بلکہ نچلے اور متوسط
طبقہ کے افراد اور کسانوں کو بھی بے روزگاری کے مسائل سے
دوچار ہونا پڑا۔

اس طرح ان ناولوں کے ذریعہ مناظرات کی
ہولناکیوں اور فرقہ وارانہ بنیاد پر تباہی و بربادی نے عوام
میں جو مایوسی اور اعصابی اضمحلال پیدا کر دیا تھا اس کا علاج
کیا گیا اور زندگی کے انتشار و اضطراب کو دور کرنے کی کوشش
کی گئی۔ اجتماعی زندگی کے شکوک و شبہات دور ہوئے اور یقین
و اعتماد کو پھر سے بحال کیا گیا۔ اسلامی زندگی کے اوراق ماضی اور

حال کی محرومیوں اور غم ناکیوں کی شدت کو ختم کر کے بہتر مستقبل
کی جستجو کے حوصلہ مند رجحان کو آگے بڑھایا گیا۔ ان ناولوں میں
اصلاحی نقطۂ نظر کو ہمیشہ فوقیت دی گئی۔ بقول وقار عظیم
"تقسیم کے بعد اردو میں جتنے ناول لکھے
اور چھاپے گئے ہیں انھیں دیکھ کر آسانی سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناول ہمارے ادب کے
موجودہ دور کی سب سے مقبول صنف ہے
گو اس سب سے مقبول صنف کو بہت کم لکھنے
والوں نے اس سنجیدگی اور انہماک کا مستحق
جانا جس کے بغیر ادبی و فنی تخلیقات عظیم نہیں
بنتیں لیکن اس کثرت اور بے توجہی میں بھی
جا بجا جواہر ریزے چمک جاتے ہیں کہ ناول کی
اردو میں بھی مستقبل کی صنف ہے بغیر چارہ
نہیں" [1]

---

[1] "داستان سے افسانے تک" وقار عظیم ص ۱۷۲

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے وقفہ میں ناول
ادب میں ایک جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ جمود کی کیفیت
عالمی اور قومی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے ان حالات و حوادث
کا نتیجہ تھی جن کے ہمہ گیر اثرات نے انسانی نفسیات کا رنگ بدل
دیا جسے دیکھ کر ادیب مبہوت رہ گیا۔ ہندوستان کی اجتماعی زندگی
میں تقسیم، فسادات، ہجرت یا دیسی ریاستوں اور زمینداری
کے خاتمہ نے جو ہلچل پیدا کی تھی وہ اتنی اہم نہیں تھی اہم تبدیلی تو وہ
تھی جو انسانوں کے دلوں میں ذہنی اور جذباتی رشتوں کے ٹوٹنے
سے پیدا ہو رہی تھی اس تبدیلی نے اردو ناول نگاری کو بھی متاثر
کیا لیکن اس جمود کے بعد کی ناول نگاری نے اس جمود کی کمی پوری
کر دی۔ ناول نگاروں نے زندگی پر اثر انداز ہونے والی سماجی
تاریخی اور ذہنی قوتوں کے مزاج کو سمجھ کر اپنے ناولوں میں
پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہایت خلوص اور دیانت
داری سے معاشرتی کرب و انبساط کو پیش کیا ہے۔ معاشرتی
تغیرات کے ساتھ فرد کی داخلی کیفیتوں، جذباتی ردعمل اور
فکری تقاضوں کی کامیاب عکاسی کی ہے۔

تقسیم کے بعد ہندوستانی معاشرہ بھی ان تغیرات
اور انقلابات سے متاثر ہوا جو ساری دنیا میں برپا ہو رہے تھے
جس نے نئے انسانی طرز زندگی، انداز فکر اور انسان کی نفسیات
کے لیے نئے آفاق دریافت کیے۔ چناں چہ ان تبدیلیوں کی وجہ
سے ناول کا فنی اسلوب بھی بدلتا گیا۔ عام انسان کے کردار، مزاج
اور ذہنی رویوں میں جو بنیادی آیا ہے اسے ناولوں میں بآسانی دیکھا
جاسکتا ہے۔ اس دور کے ناولوں میں زندگی کی خارجی حقیقتیں بھی
ہیں اور ان کے پس منظر میں جو باطنی محرکات موجزن ہیں ان کی
ترجمانی بھی ملتی ہے۔ ان ناولوں میں عصری بصیرت، سیاسی شعور
اور سماجی معنویت نظر آتی ہے۔ اگر اسی طرح ناول کا فن زندگی
سے وابستہ رہا تو یقیناً اردو ناول کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

# کتابات

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ ناول کیا ہے | ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی | ۱۹۶۵ء لکھنؤ |
| ۲۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید | علی عباس حسینی | ایڈیشن ۱۹۹۵ء |
| ۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ | ڈاکٹر محمد احسن فاروقی | ۱۹۶۲ء لکھنؤ |
| ۴۔ اردو ناول نگاری | سہیل بخاری | ۱۹۶۵ء لاہور |
| ۵۔ داستان سے افسانے تک | وقار عظیم | ایڈیشن ۱۹۸۷ء |
| ۶۔ تحریریں | ڈاکٹر گیان چند جین | ۱۹۶۴ء لکھنؤ |
| ۷۔ اردو ناول پریم چند کے بعد | ڈاکٹر ہارون ایوب | ۱۹۷۸ء لکھنؤ |
| ۸۔ اردو ناول آزادی کے بعد | ڈاکٹر اسلم آزاد | |
| ۹۔ بیسویں صدی میں اردو ناول | ڈاکٹر یوسف سرمست | ۱۹۷۳ء حیدرآباد |
| ۱۰۔ اردو کی ادبی تاریخ | عبدالقادر سروری | ۱۹۵۸ء حیدرآباد |
| ۱۱۔ اردو ادب آزادی کے بعد | ڈاکٹر محمد ذاکر | |
| ۱۲۔ اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ | ڈاکٹر رضیہ سلطانہ | حیدرآباد |
| ۱۳۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک | ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی | |
| ۱۴۔ جدید اردو ادب | ڈاکٹر محمد حسن | ۱۹۵۴ء لکھنؤ |

۱۵۔ نیا ادب — کشن پرشاد کول — ۱۹۴۹ء
انجمن ترقی اردو کراچی

۱۶۔ ترقی پسند ادب — عزیز احمد — ۱۹۴۵ء حیدرآباد

۱۷۔ ترقی پسند ادب — سردار جعفری — ۱۹۵۷ء
انجمن ترقی اردو علیگڑھ

۱۸۔ ذوق ادب و شعور — پروفیسر احتشام حسین — ۱۹۵۵ء لکھنؤ

۱۹۔ ادب و شعور — ممتاز حسین — ۱۹۶۱ء کراچی

۲۰۔ تنقیدیں — ڈاکٹر خورشید الاسلام — ۱۹۵۷ء
انجمن ترقی اردو علیگڑھ

۲۱۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن

۲۲۔ تلاش و توازن — پروفیسر قمر رئیس

۲۳۔ قومی تہذیب کا مسئلہ — ڈاکٹر عابد حسین

۲۴۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں — " — ۱۹۶۵ء دہلی

۲۵۔ جدید ہندوستان — بپن چندر — ۱۹۷۱ء دہلی

۲۶۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری — ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب
۱۹۶۱ء انجمن ترقی اردو کراچی

۲۷- سرشار ایک مطالعہ — پریم پال اشک — ۱۹۶۸ء — آزاد کتاب گھر دہلی

۲۸- پریم چند کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر قمر رئیس — ۱۹۶۳ء علیگڈھ

۲۹- پریم چند شخصیت اور کارنامے — مرتب ڈاکٹر قمر رئیس — ۱۹۶۲ء دہلی

۳۰- کہانی اور اس کا فن — ایس انتولوف مترجم مغنی تبسم

۳۱- مراۃ العروس — نذیر احمد

۳۲- بنات النعش — نذیر احمد

۳۳- توبۃ النصوح — نذیر احمد

۳۴- ابن الوقت — نذیر احمد — ۱۹۶۱ء لاہور

۳۵- فسانہ آزاد — رتن ناتھ سرشار — ۱۹۳۵ء لکھنو

۳۶- فردوس بریں (مرتبہ وقار عظیم) — عبدالحلیم شرر — ۱۹۶۱ء لاہور

۳۷- فسانہ خورشیدی — نواب افضل الدین احمد

۳۸- افشائے راز — مرزا ہادی رسوا — ۱۸۹۶ء لکھنو

۳۹- ذات شریف — مرزا ہادی رسوا — ۱۹۲۱ء لکھنو

۴۰- اختری بیگم — مرزا ہادی رسوا — ۱۹۵۲ء کراچی

۴۱- امراؤ جان ادا — مرزا ہادی رسوا — ۱۹۵۸ء دہلی

| | | |
|---|---|---|
| ۴۲۔ ایک شاعر کا انجام | نیاز فتحپوری | ۱۹۱۲ء نکھنو |
| ۴۳۔ شہاب کی سرگزشت | نیاز فتحپوری | |
| ۴۴۔ یاسمین | مرزا محمد سعید | ۱۹۳۵ء لاہور |
| ۴۵۔ خواب ہستی | مرزا محمد سعید | ۱۹۳۷ء لاہور |
| ۴۶۔ شیاما | کشن پرشاد کول | |
| ۴۷۔ سرگذشت ہاجرہ | صفدر ہمایون مرزا | ۱۹۲۶ء حیدرآباد |
| ۴۸۔ زہرہ المعروف مشیر نسواں | صفدر ہمایون مرزا | ۱۹۰۶ء حیدرآباد |
| ۴۹۔ گوشہ عافیت | پریم چند | ۱۹۲۹ء لاہور |
| ۵۰۔ میدان عمل | پریم چند | ۱۹۵۲ء دہلی |
| ۵۱۔ پردہ مجاز | پریم چند | ۱۹۴۸ء دہلی |
| ۵۲۔ گئودان | پریم چند | ۱۹۶۱ء دہلی |
| ۵۳۔ لندن کی ایک رات | سجاد ظہیر | |
| ۵۴۔ گریز | عزیز احمد | |
| ۵۵۔ ایسی بلندی ایسی پستی | عزیز احمد | ۱۹۴۸ء لاہور |
| ۵۶۔ شکست | کرشن چندر | |
| ۵۷۔ غدار | کرشن چندر | |

| | | |
|---|---|---|
| ۵۸۔ اور انسان مر گیا | راما نند ساگر | |
| ۵۹۔ خاک اور خون | نسیم حجازی | ایڈیشن ۱۹۹۳ لاہور |
| ۶۰۔ میرے بھی صنم خانے | قرۃ العین حیدر | ۱۹۴۸ء دہلی |
| ۶۱۔ سفینۂ غم دل | قرۃ العین حیدر | |
| ۶۲۔ آخر شب کے ہم سفر | قرۃ العین حیدر | |
| ۶۳۔ آگ کا دریا | قرۃ العین حیدر | مکتبہ جدید لاہور |
| ۶۴۔ چاندگہن | انتظار حسین | ایڈیشن ۱۹۹۲ لاہور |
| ۶۵۔ تذکرہ | انتظار حسین | ۱۹۶۲ء لاہور |
| ۶۶۔ بستی | انتظار حسین | |
| ۶۷۔ آنگن | خدیجہ مستور | ہمالیہ بک ہاؤس دہلی |
| ۶۸۔ زمین | خدیجہ مستور | |
| ۶۹۔ اداس نسلیں | عبداللہ حسین | |
| ۷۰۔ تلاش بہاراں | جمیلہ ہاشمی | |
| ۷۱۔ لہو کے پھول | حیات اللہ انصاری | |
| ۷۲۔ آبلہ پا | رضیہ فصیح احمد | ۱۹۶۲ء دہلی |
| ۷۳۔ آزادی | چمن لال مترجم شجاع الدین | ۱۹۸۴ء ساہتیہ اکیڈمی |

۷۴۔ پاکستان اکسپریس — خشونت سنگھ

۷۵۔ شکست کی آواز — قاضی عبدالستار — ادارہ فروغ اردو

۷۶۔ غبارِ شب — قاضی عبدالستار

۷۷۔ نقوش — مئی ۱۹۵۲ء — لاہور

۷۸۔ اردو ادب — ۱۹۶۵ء — علی گڑھ

۷۹۔ ادب لطیف — جنوری ۱۹۶۱ء

۸۰۔ قومی زبان — اپریل ۱۹۶۴ء — کراچی

۸۱۔ فنون — مئی جون ۱۹۶۵ — لاہور

۸۲۔ عصری ادب — جنوری ۱۹۷۱ء

۸۳۔ فنون — اکتوبر نومبر ۱۹۷۲ء — لاہور

۸۴۔ آج کل — اگست ۱۹۷۲ء — دہلی

۸۵۔ ENCYCLOPEDIA OF BARTANICA

۸۶۔ HISTORY OF THE ENGLISH NOVEL:
ERNEST A. BAKER (LONDON)

THE NOVEL & THE PEOPLE: RALPH FOX. nd
1956 (MOSCOW)

NOVEL & THE MODERN WORLD BY .٨٨

DAVID DIACHES

ASPECTS OF THE NOVEL : E·M·FORSTER .٨٩

1962 (LONDON)

THE TECHNIQUE OF ENGLISH NOVEL .٩٠

BY CHATAPADHAYA

INDIA SINCE PARTITION : ANDREW .٩١

MELLAR

DISCOVERY OF INDIA : J. NEHRU .٩٢

(LONDON)